جدید فلاسفہ سیریز

روسو

(یورپی روشن خیالی کا نمائندہ)

قاضی جاوید

مشعل

روسو

قاضی جاوید

مشعل
آر- بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس
عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور54600 ' پاکستان

انتساب

محترم پروفیسر فتح محمد ملک کے نام

پہلی بات

جدید ذہن اور شعور کی تشکیل میں اٹھارہویں صدی کے فرانسیسی مفکر ژاں ژاک روسو نے نمایاں کردار ادا کیا ہے- اس کتاب میں اس کی زندگی اور نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے-

ایہ ابتدائی نوعیت کی مختصر کتاب ''جدید ذہن کے معمار'' سیریز کا حصہ ہے اور ان لوگوں کے لکھی گئی ہے جو روسو کے بارے میں بنیادی معلومات اور اس کے نظریات سے عمومی آ گاہی میں دلچسپی رکھتے ہیں-اس کی تیاری میں روسو کو اپنی تحریروں سے مدد لی گئی ہے، تاہم اس کے حالات زندگی اور بنیادی تصوریات کی وضاحت کے لیے جان مورلے کی دو جلدوں پر مشتمل کتاب ''روسو'' راجر ڈی ماسٹرز کی تصنیف ''روسو'' جے ایچ -بروم کی کتاب ''روسو، اس کی فکر کا ایک مطالعہ'' اور ہنری لارڈ بروگھم کے مضامین پر زیادہ انحصار کیا گیا ہے- جان مورلے کی کتاب کا پہلا ایڈیشن 1873ء میں لندن سے شائع ہوا تھا - میرے زیر مطالعہ اس کتاب کا میکملن اینڈ کمپنی، لندن کی طرف سے شائع ہونے والا 1905ء کا ایڈیشن رہا- بروم کی کتاب 1963ء می ایڈورڈ آ رنلڈ (پبلشرز) لمیٹڈ نے لندن سے شائع کی- راجر ڈی ماسٹرز کی مذکورہ تصنیف پرنسٹن یونیورسٹی پریس کی طرف سے 1968ء میں منظرعام پر آئی جبکہ ہنری لارڈ بروگھم کے مضامین اس کی کلیات کی دوسری جلد میں شامل ہیں- دوسری جلد کا عنوان ''جارج سوم کے عہد کے مصنفین'' ہے-

میں ''مشعل'' کا ممنون ہوں جس نے یہ سیریز لکھنے کا موقع دیا اور ڈاکٹر انیس ناگی صاحب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کتاب میں استعمال ہونے والے اکثر فرانسیسی ناموں کو تلفظ سمجھایا-

فہرست

1-	تعارف	7
2-	ابتدائی زندگی	14
3-	شباب اور بگاڑ	19
4-	زندگی کی جدوجہد	25
5-	بت دہقان	33
6-	دوسرا مقالہ	46
7-	محبوب شہر اور والتیئر	52
9-	رومان اور ناول	59
10-	معاہدہ عمرانی	69
11-	ریاست اور مذہب	77
12-	تعلیم وتربیت	83
13-	جلاوطنی کے دن	90
14-	آخری سال	98

تعارف

ژاں ژاں روسو اپنے دامن میں گہری اور دوررس تبدیلیاں لے کر آنے والی اٹھارہویں صدی کا نمائندہ فلسفی اور ادیب ہے۔ اس کی عظمت کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اس کی تحریریں ایک عہد کے زوال اور تاریخ کے ایک نئے دور کے آغاز کی نشاندہی کرتی ہیں۔

ہم یہ نہیں کہیں گے کہ روسو نے جو خیالات پیش کئے، وہ مکمل طور پر اچھوتے تھے۔ خیالات کسی پراسرار دنیا سے نازل نہیں ہوا کرتے جس کو غالب نے ''عالم غیب'' کا نام دیا ہے۔ زندگی کے بدلتے ہوئے سانچوں کے ساتھ ساتھ خیالات رفتہ رفتہ ارتقا پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ روسو سے مخصوص کئے جانے والے خیالات، قدرے مختلف صورتوں اور بدلے ہوئے سیاق وسباق میں پہلے ہی منظر عام پر آ رہے تھے اور اس کے بعض معاصرین بھی ملتے جلتے خیالات پیش کر رہے تھے۔ پھر بھی فرانس سے تعلق رکھنے والے اس فلسفی کے خیالات کی وضاحت اور ان کے اثر و رسوخ کے باعث ہم کہہ سکتے ہیں کہ روسو مغرب میں کلاسیکیت کے خاتمے کی تجسیم ہے۔ علاوہ ازیں سیاست اور مذہب کے شعبوں میں وہ ریاست اور کلیسا کے حقوق سے متعلق قرون وسطیٰ کے نظریات کے خاتمے کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے سیاسی نظریات قرون وسطی میں جڑیں رکھنے والے خیالات کو رد کر کے ریاست کے جدید تصورات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ مذہب، کلیسا، ادب، مملکت اور سماج میں خارجی پابندیوں کی گرفت کو نرم کرنے کے درپے تھا۔ ماضی کے بارے میں اس کا انداز فکر مجموعی طور پر نئے انقلابی رویے مرتب کرتا ہے۔

دوسری طرف وہ انفرادی زندگی اور شخصی آزادی میں جذباتی شرکت کی دعوت دیتا ہے جو رومانیت کا امتیازی پہلو ہے۔ وہ خارج سے نافذ ہونے والی کسی حاکمیت کے خلاف آزادی کا علمبردار ہے۔ خارجی نظم وضبط کے خلاف وہ فطری اضطراری رجحان کو مضبوط دیکھنے کا خواہاں تھا اور سماجی رواجوں کے خلاف فرد کے احساسات کی تائید کرتا تھا۔ ان کو اس نے

''ضمیر'' کا نام دیا۔

روسو کی موجودہ شہرت کا زیادہ تر انحصار اس کی کتاب ''معاہدہ عمرانی'' پر ہے۔ یہ کتاب ان اصولوں کی جستجو پر مبنی ہے جن کو کسی سماج کی جائز بنیاد ہونا چاہئے۔ وہ سوال اٹھاتا ہے کہ ایسا کیوں ہے کہ فطرت نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے مگر جدھر دیکھو وہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا دکھائی دیتا ہے؟ انسان کی غلامی میں سماج نے زیادہ حصہ لیا ہے۔ وہ غلامی کی زنجیریں تیار کرنے والے سماج کے خلاف بغاوت کا درس دیتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ عالم فطرت کے مقابلے میں سماج کا جواز بس یہ ہے کہ انسان جو فطری طور پر آزاد ہیں، وہ سلامتی اور اپنے آپ کو بہتر بنانے کی خاطر کسی سماجی معاہدے پر رضامند ہو جائیں۔ روسو کے نظریے کی رو سے ہر وہ حکومت ناجائز قرار پاتی ہے جو آمرانہ ہے اور عوام کی مرضی کے بغیر وجود میں آئی ہے۔ وہ ایک ایسے سماج اور سیاسی نظام کی تمنا کرتا ہے جو انسانوں کو ویسی ہی آزادی کی ضمانت دے جو ان کو عام فطرت میں میسر تھی۔

یہ مانا کہ اس کے استدلال میں کئی جھول اور تضادات ہیں لیکن اس کی تاریخی اہمیت غیر مشتبہ ہے اور اس کی مقبولیت کم نہیں ہوئی ہے۔ امریکی آزادی کا منشور تیار کرنے والوں نے ہزاروں میل دور رہتے ہوئے اٹھارہویں صدی ہی میں اس کے گہرے اثرات قبول کئے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے منشور میں روسو کی مختلف تحریروں سے اخذ کی ہوئی اصطلاحیں بھی استعمال کی تھیں۔

مزید برآں یہ روسو تھا جس کی تصانیف نے اہل فرانس کو نئے آدرش دیئے، آزادی کی اہمیت کا احساس دلایا اور زوال پذیر جاگیرداری، سیاسی اور سماجی نظام کو بدلنے کی ترغیب دی۔ بہت سے ناقدین آج بھی روسو کو اس دانشور کا درجہ دیتے ہیں جس نے عوام کو انقلاب فرانس کے لئے دوسروں سے زیادہ تخلیقی تحریک دی۔

آج دنیا بھر میں جمہوریت اور انسانی حقوق کا چرچا ہے اور روسو ان فلسفیوں، دانشوروں اور ادیبوں میں پیش پیش ہے جنہوں نے جدید سیاسی شعور اور اقدار کی تشکیل میں حصہ لیا تھا۔ اس کے خیالات نے جرمنی میں ہرڈر، شلر اور کانٹ کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ انگلستان میں گارڈون اور ورڈز ورتھ اس کے زیر اثر آئے۔ یورپ کے دوسرے حصوں میں بھی انیسویں صدی کے فلسفیوں، ادیبوں، شاعروں اور ماہرین تعلیم پر اس کے گرے

اثرات صاف طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

دور جدید کے بعض ماہرین عمرانیات روسو کو سماجی علوم کا پیش رو کا درجہ دینے پر آمادہ ہیں اور چند ایسے ہیں جو اس کو ان علوم کا بانی مانتے ہیں۔ ایک ممتاز سماجی سائنسدان ایمل درخیم ہم کو یقین دلاتا ہے کہ روسو نے دوسروں سے پہلے اس حقیقت کو واضح کر دیا تھا کہ حیوانی سطح سے اوپر اٹھنے کیلئے انسان کو لازمی طور پر فطری حالت سے دستبردار ہو کر سماجی زندگی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ انسان کو حیوان سے ممتاز کرنے والی خصوصیت اس کی تکمیل پذیری ہے، لیکن تکمیل پذیری اور اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لئے انسان کو سماج کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سماج ہی ہے جو انسان کو بڑھنے اور پھولنے پھلنے کے مواقع مہیا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب انسان سماجی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو اس کو اپنی تکمیل کرنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔ اس کے برخلاف فطرت کی حالت میں تکمیل پذیری کی صلاحیتیں محض امکان کی صورت میں موجود رہتی ہیں۔ مادری اور تہذیبی ارتقا کے ساتھ ساتھ سماج میں انسان کی اخلاقی اور روحانی نشوونما کا عمل شروع ہوتا ہے۔

بلاشبہ تکمیل پذیری کا عمل خطرے سے خالی نہیں۔ وہ اپنے جلو میں کئی خرابیاں بھی لاتا ہے۔ سب سے بڑی خرابی تو یہ ہے کہ آگے کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے سماج انسانوں کو ان فطری آزادی سے محروم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ روسو کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے ہم کو بتایا کہ ایسے سماجی نظام کی تشکیل ممکن ہے جو انسانوں کی چھینی ہوئی آزادی کو واپس کر دے۔

روسو کے بارے میں ایک اور بات ذہن میں رکھنی چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ ان فلسفیوں میں سے ایک تھا جو غیر معمولی شخصیت کے مالک ہوا کرتے ہیں۔ روسو کو خود بھی اس امر کا احساس تھا۔ ''اعترافات'' کے عنوان سے اپنی خودنوشت کا آغاز وہ ان الفاظ سے کرتا ہے کہ ''میں نے زندگی میں جن لوگوں کو دیکھا ہے، میں ان میں سے کسی ایک جیسا بھی نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میری قدر و قیمت ان سے زیادہ نہ ہو لیکن میں ان سب سے مختلف ضرور ہوں۔ قدرت نے مجھے بنانے کے بعد مجھے بنانے والا سانچہ توڑ کر اچھا کیا تھا یا برا؟ اس بات کا فیصلہ تو مجھے پڑھنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔''

اس کو پڑھنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کے تجربات نے اس کے فکر کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی زندگی اور فکر کو الگ الگ

نہیں کیا جا سکتا۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں۔ یہاں ہم مثال دینا چاہیں تو ایک نکتہ بالکل صاف طور پر ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ روسو نے اپنی کئی تحریروں میں سائنس اور علوم وفنون کی مذمت کی ہے اور ان کو تہذیب کی ترقی کے بجائے زوال کا سبب قرار دیا ہے۔ ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یہ نکتہ چینی اس کے شخصی تجربے کے احساس سے پیدا ہوئی تھی، کیونکہ وہ دیکھتا تھا کہ اس کا اپنا علم اور ذہانت اخلاقی گراوٹ کا سبب بن گئی تھی۔ اس حوالے سے بعض نقادوں نے اشارہ کیا ہے اور ان کی یہ بات درست بھی ہوسکتی ہے کہ روسو کی فلسفیانہ بصیرت اس کے اپنے نفسیاتی مسائل کا نتیجہ تھی۔

روسو کی غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں، بصیرتوں اور شاندار تخیل کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ ہم کو یہ حقیقت قبول کرنے کے لئے بھی تیار رہنا ہوگا کہ اخلاقی اعتبار سے اس کی شخصیت بہت کمزور تھی۔ گویا اس میں ایک طرف بہت سی خوبیاں موجود تھیں تو دوسری طرف اس میں ایسی خامیاں بھی پائی جاتی تھیں جن کو معمولی قرار دے کر نظر انداز کرنا بہت مشکل ہے۔

معاصرین کی رائے اس کے بارے میں یہی تھی اور آج بھی اس کی شخصیت اور افکار کا مطالعہ کرنے والے یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ ایک نابغہ ہونے کے باوجود کمزور اور خام اخلاقی شخصیت کا مالک تھا۔

ممکن ہے کہ وقت کی گرد روسو کی کئی خامیاں کو ڈھانپ لیتی، مگر اپنی خودنوشت میں اس نے کم وبیش اپنی تمام خامیوں کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ یوں ان کی پردہ پوشی ممکن نہیں رہی۔ کبھی کبھی وہ اپنی خرابیوں کا جواز بھی دیتا ہے اور کبھی کبھی لگتا ہے کہ جیسے اس کو اپنی کوتاہیوں کے بیان میں لطف آتا تھا۔ چنانچہ وہ ان کا بڑھا چڑھا کر ذکر کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اس کتاب میں ہم اس کی شخصیت کا جائزہ لیں گے اور افکار کا مطالعہ بھی کریں گے۔ یوں اس سے اچھے، برے، مضبوط اور کمزور پہلو ہمارے سامنے آئیں گے لیکن یاد رکھئے گا کہ یہ ایک تعارفی کتاب ہے۔ لہٰذا گہرائیوں میں اترنے کی بار بار ترغیب ملنے کے باوجود ہم سطح پر رہیں گے۔

ابتدائی زندگی

ژاں ژاں روسو کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ فرانسیسی ادیب، فلسفی اور سیاسی نظریہ ساز تھا۔ یہ تاثر درست ہے اور غلط بھی۔ اصل میں بات یہ ہے کہ اس کا تعلق ایک فرانسیسی خاندان سے تھا۔ یہ خاندان 1529ء میں پیرس سے ہجرت کر کے جنیوا میں آباد ہو گیا تھا۔ ہجرت کا سبب صاف طور پر معلوم ہے اور وہ یہ کہ اس خاندان کے ایک بزرگ دادیئے روسو نے اپنا آبائی کیتھولک مذہب چھوڑ کر پروٹسٹنٹ عقیدہ قبول کر لیا تھا۔ اس زمانے میں یہ ایک نیا عقیدہ تھا۔ اس میں نئے عقیدوں جیسا جوش وخروش موجود تھا اور اس نے مسیحی دنیا میں ہلچل مچا رکھی تھی۔ فرانس کے لوگوں کی بھاری اکثریت کیتھولک تھی۔ اس کے قوانین اور سرکاری مذہب بھی کیتھولک تھا۔ یہ آج کے فرانس کی بات نہیں بلکہ سولہویں صدی کے فرانس کا قصہ ہے۔ تب وہاں فرقہ وارانہ نفرتیں اور کدورتیں شدید تھیں۔ جو لوگ نیا پروٹسٹنٹ عقیدہ قبول کر رہے تھے۔ ان پر ہر قسم کا ستم روا کھا جاتا تھا۔ ان سے نفرت کی جاتی تھی۔ ان کو بے دین اور شیطان کے چیلے سمجھا جاتا تھا۔

روسو کے بزرگوں نے آبائی مذہب سے ہٹ کر نیا عقیدہ قبول کیا تو اس سے ہم گمان کر سکتے ہیں کہ وہ عام لوگوں سے ذرا مختلف قسم کے لوگ ہوں گے اور ان میں بزرگوں کی راہ سے ہٹ کر نئے خیالات کو قبول کرنے کا حوصلہ ہو گا۔ خیر، اس تبدیلی کے بعد وہ اپنے شہر میں نہ رہ سکے۔ ان کو بالآخر وہاں سے نکل کر جنیوا کا رخ کرنا پڑا جو اس زمانے کے یورپ میں پناگزینوں کی جنت بنا ہوا تھا۔ خاص طور پر پروٹسٹنٹ لوگ یورپ کے بہت سے حصوں سے اپنے ہم وطنوں اور اپنی حکومتوں کے ہاتھوں تنگ آ کر جنیوا پہنچ رہے تھے۔ یوں سوئٹزرلینڈ کے اس چھوٹے سے شہر نے جو اس زمانے میں ایک الگ ریاست کی حیثیت رکھتا تھا، مسیحیت کی نئی تاویل کے مرکزی شہر کا مقام حاصلکر لیا۔ ویسے ہی جیسے روم مسیحیت کی روایتی تاویل کا شہر تھا۔

روسو کو جنیوا پر ناز تھا۔ اس نے اپنی کئی تحریروں میں اس شہر اور اس کے شہریوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ اس میں مبالغہ کم ہی ہے۔ بات یہ ہے کہ اس زمانے کے عمومی یورپی معیاروں کے حوالے سے دیکھا جائے تو جنیوا آزادی اور رواداری کا شہر تھا۔ مورخین کا کہنا ہے کہ سولہویں صدی کے آخری برسوں میں اس شہر کی آبادی تین ہزار خاندانوں پر مشتمل تھی۔ ان میں بمشکل پچاس خاندان ایسے تھے جن کو پروٹسٹنٹ فرقہ کو جنم دینے والی، اصلاح کلیسا کی تحریک سے پہلے شہری حقوق حاصل تھے۔ صاف طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شہر کی آبادی کا بڑا حصہ پناہ گزینوں پر مشتمل تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے اپنے وطن سے نیا عقیدہ اور نیا نظریہ لے کر آئے تھے۔ انہوں نے یہاں نئے کردار اور نئی قسم کے آداب متعارف کروائے۔ ان کی نمایاں خصوصیت مذہبی جوش وخروش تھا۔ وہ ایک نئے انسان، نئے سماج اور نئی دنیا کو وجود میں لانے کی آرزومند تھے۔

آزادی، رواداری اور خوابوں کے اس شہر میں روسو 28 جون 1712ء کو پیدا ہوا۔ روسو کی ماں، سوزین برنارڈ، شہر کے ایک پادری ایم برنارڈ کی بیٹی تھی۔ وہ ایک سیدھی سادی اور خوش باش گھریلو خاتون تھی۔ بیٹے کی پیدائش نے اس کی جان لے لی۔ روسو نے لکھا ہے کہ ''میں اپنی ماں کی موت کا پیام لایا۔ میرا جنم میری پہلی بدقسمتی تھا۔'' وہ خود بھی نیم مردہ سا پیدا ہوا تھا۔ ایک پھوپھی کی شفقت آمیز توجہ اس کو موت کے منہ سے واپس لے آئی مگر وہ عمر بھر کمزور اور ناتواں ہی رہا۔

روسو کا باپ، آئیزک روسو، بہت سی خوبیوں اور کئی قابل ذکر صلاحیتوں کا مالک تھا اور محسوس کرنے والا دل رکھتا تھا، مگر اس کو چین نہ تھا۔ پاؤں میں ایک چکر تھا جو اس کو دیس بدیس لئے پھرتا تھا۔ وہ اپنے پہلے بچے کی پیدائش کے بعد قسطنطنیہ چلا گیا تھا۔ ایک بار بیوی نے پیغام بھجوایا کہ جنیوا میں تعینات فرانسیسی ریذیڈنٹ کی محبت بھری نظروں اور نوازشوں سے اس کا دم گھٹنے لگا ہے، تو اس نے بے نیازی سے کام نہ لیا اور لوٹ آیا۔ اس واقعہ کے تیس سال بعد، جب روسو کی ماں کی وفات کو بہت سال بیت چکے تھے، اس ریذیڈنٹ نے بیٹے کے سامنے ماں کا ذکر آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ کیا تھا۔

قسطنطنیہ سے بڑے روسو کی واپسی کے دس ماں بعد ژاں ژاک روسو پیدا ہوا۔ آئیزک روسو کو بیوی کی وفات سے گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ وہ دکھ سے اس کا ذکر کرتا۔ اس کی یاد

میں روتا۔ ماں گھر میں بہت سی کتابیں چھوڑ گئی تھی جو اس کو اپنے پادری باپ سے ملی تھیں۔ ان میں زیادہ تر داستانیں اور رومانوی قصے کہانیاں تھیں۔ آیزک روسو محبوب بیوی کی یاد میں اس کی چھوڑی ہوئی کتابیں پڑھنے لگا اور ننھے روسو کو اس کام میں اپنا ساتھی بنا لیا۔ جب روسو پانچ سال کا تھا تو وہ باپ کے ساتھ مل کر رات گئے تک یہ قصے کہانیاں پڑھتا۔ کبھی کبھی رات یونہی بیت جاتی۔ جب رات کی سیاہی ختم ہوتی، دن طلوع ہوتا تو ان دونوں کو حقیقی زندگی کا احساس دلاتا۔ ایسے موقعوں پر باپ بیٹے سے کہہ اٹھتا ''میاں، مجھ میں تم سے بھی زیادہ بالپن ہے۔''

یہ کتابیں ختم ہوئیں تو نئی کتابیں آ گئیں۔ ہوا یہ کہ انہی دنوں روسو کے نانا کا انتقال ہو گیا۔ اس کے پاس جو کتابیں رہ گئی تھیں، وہ بھی باپ بیٹے کو مل گئیں۔ جو نئی کتابیں آئیں، وہ ذرا سنجیدہ قسم کی تھیں۔ خاص طور پر تاریخ کے موضوع پر کئی اچھی کتابیں ان میں شامل تھیں۔ مثال کے طور پر ان میں روم کی تاریخ کے علاوہ عظیم افراد کی زندگیوں پر لکھی ہوئی پلوٹارک کی کتاب بھی تھی۔ باپ بیٹا مل کر اب ان کو پڑھنے لگے۔

اس خاندان کے اکثر افراد گھڑی ساز تھے۔ روسو کا باپ بھی یہی کام کرتا تھا۔ ان لوگوں کا تعلق جنیوا شہر کے پانچ طبقوں میں سے درمیانے طبقے کے ساتھ تھا۔ اس طبقے کو شہری حقوق حاصل تھے۔ اس زمانے میں یہ ایک متحرک طبقہ تھا جو روسو کے بچپن میں زیادہ ہی فعال ہو گیا تھا۔ اس نے حکمران طبقوں سے زیادہ حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کر دی تھی۔ آیزک روسو مختلف قسم کا آدمی تھی۔ اس کو آزادی پسند تھی اور وہ جھگڑالو بھی تھا۔ طویل سیر و سیاحت اور بیوی کے بے وقت موت کے گہرے صدمے کے باوجود اس کی طبیعت کی بے چینی کم نہ ہوئی تھی۔ اس کی یہ خصوصیات جنیوا کے شہریوں کے عمومی رویوں سے مختلف تھیں۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں یہ لوگ خوش حالی اور سماجی استحکام کے باعث آرام دہ زندگی کے عادی ہو رہے تھے۔

یہ باپ ہی تھا جو بچپن میں روسو کے سب سے زیادہ قریب تھا۔ لہٰذا فطری طور پر اس نے سب سے زیادہ اثرات باپ کی شخصیت کے قبول کیے۔ اس پر بھی بے چینی، اضطراب، جذبات پرستی اور تلون مزاجی نے غلبہ پا لیا۔ زندگی جس انداز میں گزر رہی تھی، وہ شہر کے عام گھروں سے بہت مختلف تھا۔ ایک جگہ روسو نے لکھا ہے کہ اس کے جذبے وقت

سے پہلے ہی متلاطم ہو گئے تھے اور یہ کہ بچپن میں اس کو حقیقی چیزوں کا بھی کوئی تصور نہ تھا لیکن وہ احساسات اور جذبات سے شناسا ہو گیا تھا۔ وہ دنیا کو تصور کے بجائے احساس کے ذریعے سمجھنے لگا اور زندگی کا ڈھانچہ عقل کے بجائے جذبوں پر استوار ہونے لگا۔ جو آخر کار رنگ لائے۔ انہوں نے مختلف قسم کے عقلی رویوں اور مزاج کو جنم دیا۔ زندگی کے بارے میں اس کا نقطہ عجیب وغریب اور رومانوی خیالات پر مبنی تھا۔

اس ماحول میں شب و روز گزارتا ہوا روسو آٹھ سال کا ہونے کو تھا مگر اس کی باقاعدہ تعلیم کا ابھی کوئی انتظام نہ ہوا تھا۔ وہ گھر میں رہتا اور باپ کے ساتھ مل کر کتابوں کی دنیا میں کھویا رہتا۔ وہ دونوں اب سوانح عمریوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگے تھے۔ پلوٹارک نے روسو کا دل جیت لیا۔ جب باپ کام میں مصروف ہوتا تو بیٹا اس کو پلوٹارک پڑھ کر سناتا۔ بعد میں دوبارہ بھی اس کو پڑھتا۔ پلوٹارک سے اس کا لگاؤ زندگی کے آخری دور تک قائم رہا۔

12 جنوری 1762ء کو میل شربس کے نام ایک خط روسو نے ان دنوں کے مطالعات کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''جب میں چھ سال کا تھا تو پلوٹارک کو پڑھ چکا تھا۔ آٹھ سال کی عمر میں اس کی کتاب مجھ کو زبانی یاد ہو چکی تھی۔ میں نے تمام دستیاب ناول پڑھ لئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے اس وقت سے بہت پہلے آنسو بہانے شروع کر دیئے تھے جبکہ دل اس قسم کی کتابوں میں دلچسپی لیا کرتے ہیں۔ ان کتابوں سے میرے اندر وہ جوانمردانہ اور رومانوی ذوق پیدا ہوا جو اب تک بڑھتا جا رہا ہے۔ اس ذوق نے ماسوائے ان چیزوں کے جو میری حماقتوں سے مشابہت رکھتی ہیں، باقی تمام چیزوں سے مجھے بے زار کر دیا ہے۔'' بعد میں ''اعترافات'' میں اس نے اپنے مطالعہ اور قبل از وقت پیدا ہونے والی تکلیف وہ شہوت پرستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ''میرا بچپن کسی بچے کے بچپن جیسا نہ تھا۔ میرے احساسات اور خیالات ہمیشہ بالغ مرد جیسے رہے۔''

روسو کا ایک بھائی بھی تھا جو اس سے سات آٹھ سال بڑا تھا۔ خاندان میں وہ کبھی لاڈلا نہ رہا تھا۔ لگتا ہے کہ گھر میں اس کی کوئی پروا نہ کرتا اور اس کا وجود غیر ضروری سمجھا جاتا تھا مگر وہ بالکل باپ جیسی عادات رکھتا تھا۔ اس نے باپ کا ہنر سیکھا اور گھڑی ساز بن گیا۔ طبیعت کی بے کلی اور باغیانہ احساسات نے عالم شباب میں پہلا قدم رکھتے ہی اس کو گھر

سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ جرمنی کی طرف نکل گیا تھا۔ پھر کبھی اس کا عزیزوں سے رابطہ نہ ہوا اور نہ ہی گھر والوں نے اس کو ڈھونڈنے اور واپس لانے کی کوئی کوشش کی۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس پر کیا گزری، شاید ہم گمان کر سکتے ہیں کہ وہ چھوٹے بھائی کے مشہور ہونے سے پہلے ہی مر کھپ گیا تھا۔ وگرنہ وہ بھائی سے کوئی رابطہ کرتا۔

گھر کی ویرانی، رومانوی قصوں اور زندگی کے حادثوں نے روسو کے دل میں موسیقی کی لگن پیدا کر دی جو عمر بھر قائم رہی۔ یہاں تک کہ وہ ایک عرصے تک موسیقی سے روزی کماتا رہا۔ گھر کی دیکھ بھال اور روسو کی دیکھ بھال کرنے والی پھوپھی اپنی سریلی آواز میں لوک گیت گنگنایا کرتی تھی۔ وہ اس علاقے کے مقبول عام لوک گیت ہوا کرتے تھے۔ ان گیتوں کا جادو روسو پر بھی چل گیا۔

ایک روز زندگی کا یہ سارا معاملہ الٹ گیا۔

روسو آٹھ نو سال کا تھا تو ایک روز آئزک روسو ایک فرانسیسی افسر سے الجھ پڑا۔ فرانسیسی بااثر تھا۔ آئزک روسو ڈر گیا۔ اس نے جانا کہ اب کئی سال اس کو جیل میں گزارنے پڑیں گے۔ چنانچہ وہ بھاگ نکلا۔ اس نے لوزین کا رخ کیا۔ وہاں ایک عورت سے بیاہ جو بڑی عمر کی تھی، لیکن اس کے بچے نہ تھے۔

روسو کی زندگی کی کہانی میں اب اس کے باپ کا ذکر نہ آئے گا۔

شباب اور بگاڑ

زندگی کا جو سانچہ تھا، وہ باپ کے جانے سے ٹوٹ پھوٹ گیا۔ روسو کی پرورش کی ذمہ داری اب اس کے گھڑی ساز چچا نے سنبھالی۔ چچا نے اس کو بو سے کے نواحی گاؤں کے مدرسے میں داخل کروایا۔ یہ 1722ء کا واقعہ ہے۔ گویا روسو تب دس سال کا تھا۔ مدرسے میں وہ ایک پادری کی نگرانی میں آ گیا۔ وہیں اس نے لاطینی زبان کی شدبد حاصل کی جو اس زمانے تک یورپ میں اہم زبان خیال کی جاتی تھی مگر وہ کند ذہن نکلا۔ ہزار جتن کے باوجود اس زبان پر عبور حاصل نہ کر سکا۔

ہم یہ بات ذہن میں رکھیں گے کہ مدرسے کے اساتذہ کو روسو کو پڑھانے میں کئی دشواریاں پیش آئی ہوں گی۔ واقعی اس بچے کو تعلیم دینا آسان نہ ہوسکتا تھا جو زندگی علم کی مذمت کے لیے وقف کرنے والا تھا۔ وجہ محض یہ نہ تھی کہ وہ خود علم سے محروم رہا تھا بلکہ بات یہ ہے کہ وہ علم کو انسانی کردار کے لئے نقصان دہ سمجھتا تھا۔ ہمارے کئی صوفی بزرگوں اور شاعروں کی طرح اس کا خیال بھی یہ تھا کہ علم دانائی اور راست بازی کو ضعف پہنچاتا ہے۔

بوسے کے مدرسے کے اساتذہ ناکام رہے۔ ان کا یہ شاگرد معیاری تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے کردار کی صحت مند نشوونما میں بھی مدد نہ مل سکی۔ مدرسے کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے جب اس کو کسی غلطی کے بغیر سزا ملی تھی۔ ہوا یہ کہ اس پر ایک کنگھی توڑنے کا الزام لگایا گیا جو اس نے نہیں توڑی تھی۔ اساتذہ نے الزام قبول کرنے کے لیے اس پر دباؤ ڈالا اور سزا بھی دی، مگر وہ ڈٹ گیا اور ناروا الزام قبول کرنے پر کسی طور پر آمادہ نہ ہوا۔

ہوسکتا ہے کہ اساتذہ اور دوسرے طلباء نے چند روز کے بعد اس واقعہ کو بھلا دیا ہو

لیکن روسو اس کو کبھی نہ بھلا سکا۔ جن لوگوں کا وہ مداح تھا اور جن کا وہ دل کی گہرائیوں سے احترام کرتا تھا، وہ اس کے ساتھ بے انصافی اور بے رحمی سے کام لے رہے تھے۔ کئی سال بعد اس نے لکھا کہ ''میں جب کبھی کبھی کسی غضب ناک حاکم یا کسی اور شخص کے ظلم وستم اور بے انصافی کے واقعات پڑھتا یا سنتا ہوں تو مجھے وہ اپنا وقت یاد آ جاتا ہے۔'' وہ ہم کو بتاتا ہے کہ یہ ایسا واقعہ تھا جس کے ساتھ ہی بچپن کی خوشیاں ختم ہو گئیں اور مسرتوں سے لطف اٹھانے کے دن بیت گئے۔

شاید ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس واقعہ کے حوالہ سے اس کو جھوٹ، بے انصافی اور بے رحمی کا جو ناگوار تجربہ ہوا، اس نے روسو کی شخصیت ہی کو بدل ڈالا۔ اس نے بے انصافی اور بے رحمی کو زندگی کا چلن مان لیا۔ اعلیٰ اقدار پر اس کا ایمان متزلزل ہو گیا۔ یوں جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ وہ خود بھی بے انصافی اور بے رحمی سے کام لینے پر تیار ہو گیا۔

آیئے، فی الحال ہم بوسے کے مدرسے کی طرف واپس چلتے ہیں۔ روسو کو وہاں زیادہ عرصہ رہنے کا موقع نہ ملا۔ اس کی طالب علمی کا زمانہ چند ماہ میں ختم ہو گیا۔ وہ مدرسے سے واپس آ گیا۔ آنے والے دو سال اس نے چچا کے پاس گزارے اور زیادہ تر وقت ضائع ہی کیا۔ مسئلہ اب یہ درپیش تھا کہ وہ کون سا پیشہ اختیار کرے۔ کیا اس کو باپ دادا کی طرح گھڑی ساز بننا چاہیئے یا پھر وہ ان کی راہ سے ہٹ کر وکیل یا پادری بن جائے؟ خود اس کو پادری بننا اچھا لگتا تھا کیوں؟ اس کا جواب یہ تھا کہ ''مجھ کو تبلیغ کرنا پسند ہے۔''

یہ خواہش انہونی نہیں۔ بات یہ ہے کہ اگرچہ اس کا باپ زندگی کی مسرتوں کے پیچھے بھاگنے والا تھا اور یہی حال چچا کا تھا مگر ان کا گھریلو ماحول مذہبی قسم کا تھا۔ چچی تو بس تقویٰ اور خدا پرستی کے لیے وقف تھی۔ پروٹسٹنٹ فرقے کا مذہبی جوش وخروش ابھی سرد نہ ہوا تھا۔ روسو کی تین پھوپھیاں بھی دین دار اور پرہیز گار تھیں اور روسو کے خاندان میں ان کا بہت اثر ورسوخ تھا۔ ایسا ہی ماحول اس کو بوسے میں ملا تھا۔ کئی سال بعد جب اس کا کردار پختہ ہوا تو بچپن کے مذہبی اثرات اور بھی نکھر گئے تھے۔

مدرسہ چھوڑے ہوئے ایک سال بیت گیا۔ روسو اب گیارہ سال کا ہو چکا تھا۔ کام سیکھنے کے لیے اس کو ایک وکیل کے دفتر میں بھیج دیا گیا۔ مگر اس کو یہ کام اچھا نہ لگا۔ خود وکیل صاحب بھی اس سے مطمئن نہ تھے اور اس کو نالائق اور غبی سمجھتے تھے۔ جلد ہی انہوں

نے روسو کو واپس بھیج دیا۔

اس کے لیے نیا کام ڈھونڈا گیا۔ چچا کے انتخاب کی داد دیجئے کہ اس نے وکیل کے دفتر سے واپس آنے والے بھتیجے کو نقاشی کا کام سیکھنے کے ایک ایک نقاش کے پاس بھیج دیا۔ چچا کے دل میں غالباً وکیل کی یہ بات بیٹھ گئی کہ روسو نالائق اور غبی ہے۔ نقاش کا رویہ بہت درشت تھا۔ مگر ننھا روسو بھی بگڑ چکا تھا۔ وہ جھوٹ بولنے کی لت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ہر معاملے میں اس نے جھوٹ بولنا شروع کر دیا تھا۔ کبھی وہ اپنی کوئی غلطی چھپانے کے لیے، کبھی کوئی خواہش پوری کرنے کی خاطر اور کبھی کسی اور بہانے سے جھوٹ کا سہارا لیتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس کو چوری کی عادت بھی پڑ گئی تھی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ''چوری کی عادت کبھی نہ جائے اور سمدھن کا تکلا چبھ چبھ جائے'' تو یہی کیفیت روسو کی رہی۔ بالغ ہونے کے بعد بھی اس میں چوری کا میلان رہا اور وہ عمر بھر، کبھی کم اور کبھی زیادہ، جھوٹ بھی بولتا رہا۔ یہاں ہم اس کی شخصیت کے ایک اور تضاد کی طرف بھی اشارہ کر دیں۔ وہ یہ ہے کہ زندگی بھر اس کا مزاج تیز و تند رہا لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ بزدل اور شرمیلا بھی تھا۔

نقاشی میں روسو کا جی نہ لگ رہا تھا۔ انہی دنوں ایک واقعہ پیش آیا جس نے بہت سی دوسری چیزوں کی طرح، اس مشقت سے بھی اس کو نجات دلا دی۔ ایک اتوار کو وہ دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے شہر سے دور نکل گیا تھا۔ جب وہ واپس آئے تو دیر ہو چکی تھی۔ شہر کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے بھی روسو کو دو بار آوارہ گردی سے واپسی پر شہر کے دروازے بند ملے تھے اور دیر سے لوٹنے پر اس کو سزا ملی تھی۔ سولہ سالہ نوجوان اور سرکش روسو اب سزا برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے شہر چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔

یہ 14 مئی 1728ء کا واقعہ ہے۔

اس نے جنیوا کو خیر باد کہا اور شہر سے لگ بھگ چھ میل کے فاصلے پر سوائے جا پہنچا۔ وہاں کیتھولک پادریوں کا ایک بڑا مرکز تھا۔ یہ لوگ جنیوا کے پروٹسٹنٹ مذہبی پیشواؤں سے شدید عداوت رکھتے تھے۔ فرقہ پرستی کے اس زمانے میں یہ معمول کی بات تھی۔ روسو کیتھولک پادریوں کی خانقاہ میں پہنچا تو اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ پادری اس کو اپنے فرقے میں شامل کرنے کے درپے تھے۔ انہوں نے اجنبی نوجوان کو اپنے عقیدے کی سچائی اور برتری کا یقین دلانے کے لیے محض جوشیلے دلائل پر اکتفا نہ کا بلکہ سرخ شراب اور لذیذ

کھانوں سے اس کی خاطر مدارت بھی کی۔ روسو کو اور کیا چاہئے تھا۔ وہ جان گیا کہ ان نیک دل احمقوں کے مذہبی جذبات سے کھیل کر وہ زندگی کی بہت سی آسائشیں حاصل کر سکتا ہے۔

روسو کے بزرگوں کو پروٹسٹنٹ مذہب قبول کرنے کے سبب اپنے آبائی وطن سے نکلنا پڑا تھا۔ اب اس نے ناہ اور چند آسائشوں کی خاطر اس مذہب کو چھوڑنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ تب شاید اس کو اچھی طرح یہ بھی معلوم نہ تھا کہ عقیدے کی اس تبدیلی کا مطلب کیا ہے۔ زندگی کے آخری برسوں میں اس واقعہ کو یاد کرتے ہوئے اس نے لکھا تھا کہ ''میں کیتھولک تو بن گیا تھا، لیکن رہا ہمیشہ پروٹسٹنٹ مسیحی''۔

اب اسکی زندگی میں ایک نئی ڈگر پر چلنے والی تھی۔ سوائے کے بشپ نے اپنا تعارفی خط دے کر روسو کو مادام دے وارین کے پاس بھیج دیا۔ وہ ایک سوئس خاتون تھی جو اپنے شوہر سے نجات پا کر کیتھولک فرقے میں داخل ہو گئی تھی اور سارڈینیا کے دین دار بادشاہ کی طرف سے ملنے والے وظیفہ پر گزارا کرتی تھی۔ اس کو کیتھولک دائرے میں داخل ہونے والے نوجوانوں کی خدمت اور تربیت کا فرض سونپا گیا تھا اور وہ یہ فرض نہایت خوبی سے ادا کرتی تھی۔ ڈاکٹر محمود حسین نے روسو کی کتاب ''معاہدہ عمرانی'' کے اردو ترجمے کے دیباچے میں اس خاتون کا تعارف بہت خوش اسلوبی سے کروایا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ مادام دے وارین کی بھی عجیب شخصیت تھی۔ روسو کی طرح اس نے بھی اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیا تھا مگر کیتھولک مذہب قبول کرنے کے بعد بھی مذہبی معاملات میں بہت آزاد خیال اور نوجوانوں کے ساتھ تعلقات میں شاید اور بھی آزاد تھی۔ تصوف سے اسے دلچسپی تھی۔ کیمیا بنانے کا اسے شوق تھا اور تجارتی سٹے بازی کا اسے مرض۔ نیک اور بد دونوں قسم کے خیالات اور جذبات اس میں یکجا پائے جاتے تھے۔ روسو کی فطرت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔ اس عورت کی صحبت میں روسو کے برے اور بھلے دونوں قسم کے رجحانات کو بڑی تقویت ملی۔ مادام دے وارین نے پہلی ہی ملاقات میں اپنے حسن و اخلاق سے روسو کا من موہ لیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اسے ایک ایسی شخصیت ہاتھ آئی ہو جو ماں کی طرح اس کی خبر گیری کرے، بیوی کی طرح اس پر جان دے۔ استاد کی طرح اس کی دماغی نشوونما میں مدد دے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی مالی پریشانیوں کو دور کرنے کے قابل ہو۔

مادام سے روسو کی پہلی ملاقات 1728ء میں ہوئی اور اس کے ساتھ بننے والا

تعلق عمر بھر قائم رہا۔ تاہم شروع میں روسو اس کے پاس چند دن ہی رہا۔ مادام نے اس کو تورین بھیج دیا۔ وہاں کی مذہبی درسگاہ اس کی پناہ گاہ بنی۔ یہ بدعقیتوں کو راہ راست پر لانے کی درستگاہ تھی مگر روسو پر اس کا الٹ اثر ہوا۔ اس کو یہاں گمراہیوں اور بدکاریوں کے طور طریقے جاننے کا موقع ملا۔ صلہ کے لالچ میں یہاں روسو نے سب کے سامنے باقاعدہ طور پر کیتھولک مذہب قبول کیا مگر پادری صاحبان بھی نرے بدھو نہ تھے۔ انہوں نے جلد ہی بھانپ لیا کہ یہ نوجوان ان کو الو بنا رہا ہے اور نئے عقیدہ کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہے۔

خیر روسو کو ان پادریوں سے چند نظریاتی اختلاف بھی تھے۔ مثال کے طور پر وہ یہ ماننے پر تیار نہ تھا کہ چونکہ اس کی ماں پروٹسٹنٹ تھی لہٰذا وہ بدعتی تھی اور مرنے کے بعد دوزخ کا ایندھن بن رہی تھی۔ پادریوں کے نزدیک اس قسم کے اختلاف کی گنجائش نہ تھی۔ انہوں نے روسو کے ہاتھ پر بیس فرانک رکھے جو اس کے سابقہ مذہب سے حلفی انکار کی تقریب میں لوگوں نے دیئے تھے اور پھر اس کو درسگاہ سے روانہ کر دیا۔

درس گاہ سے اخراج کے بعد وہ قصبے میں غریب مسافروں کی ایک سرائے میں رہنے لگا۔ کچھ عرصے بعد ایک مقامی جاگیردار خاتون نے اس کو خدمتگار کے طور پر ملازم رکھ لیا۔ وہ مادام کے دوسرے نوکروں جیسی وردی پہنتا اور ان کے ساتھ کھانا کھاتا۔ تین ماہ اس ملازمت میں گزارے تھے کہ مادام اگلے جہان کو سدھار گئیں۔ تب ان کے تمام ملازموں کو بھی فارغ کر دیا گیا۔ اس دوران ایک ایسا واقعہ رونما ہوا تو اس واقعہ کو بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس کا کوئی سوانح نگار اس واقعہ کو نظر انداز نہیں کر سکا۔

ہوا یہ کہ مادام دے ورسائے بناتے ہوئے معلوم ہوا کہ مرحومہ کا گلابی ربن غائب ہے۔ نوکروں سے پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ سب نے کہا کہ ان کو ربن کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ان نوکروں میں روسو بھی شامل تھا۔ انکار کے بعد تلاشی شروع ہوئی تو ربن روسو سے برآمد ہو گیا۔ اصل میں اس نے ربن چرایا تھا۔ سزا سے بچنے کے لیے اس نے فوراً ہی گھر کی ایک اور ملازمہ میرین پر چوری کا الزام لگا دیا اور کہنے لگا کہ اس کو یہ ربن میرین نے دیا تھا۔ وہ نوجوان اور اچھی شکل وصورت والی دوشیزہ تھی۔ اس کے روبرو سب لوگوں کے سامنے روسو نے یہ الزام دہرایا۔ وہ بے چاری خوف اور شرم سے تھر تھر کانپ رہی تھی اور روسو بے شرمی سے اس پر جھوٹا الزام لگا رہا تھا۔ بے گناہ لڑکی پر مصیبت ٹوٹ پڑی۔

اپنی اس بے انصافی، بلکہ یوں کہئے شرمناک ظلم کا روسو نے خود ذکر کیا ہے اور بے ہودگی سے اس کا جواز بھی دینا چاہا ہے۔ ''اعترافات'' میں وہ لکھتا ہے کہ ''میں نے اس لڑکی پر الزام لگایا تو شاید یہ بات واہیات محسوس ہو، لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ میری محبت میرے اس فعل کا باعث بنی تھی۔ وہ میرے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ میرے دل میں بسی ہوئی تھی۔ جب وہ میرے سامنے آئی تو میرا دل کٹ کر رہ گیا لیکن بہت سے لوگوں کی موجودگی کا دباؤ اس قدر زیادہ تھا کہ میں اپنی غلطی کا اعتراف نہ کر سکا۔ مجھ کو سزا کا خوف زیادہ نہ تھا۔ بے عزتی کا خیال زیادہ تھا۔ بے عزتی کا خوف مجھ کو موت سے، جرم سے بلکہ دنیا کے ہر شے سے زیادہ تھا۔ اس سیب چنے کی خاطر میں زمین میں سما جانے پر بھی تیار ہو جاتا۔ شرم کے احساس نے مجھے اس قدر ڈھیٹ بنا دیا............ مجھ کو اس خوف کے سوا کچھ محسوس نہ ہوتا تھا کہ سب لوگوں کے سامنے مجھ کو چور، جھوٹا، بدگو اور بہتان طراز قرار دیا جائے گا۔''

ہم چاہیں بھی تو روسو کے اس عذر لنگ کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ بے شک یہ واہیات بہانہ ہے۔ بات یہ ہے کہ بزدلی نے روسو کو اپنا جرم تسلیم کرنے سے روکا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ ایک معصوم اور بے بس لڑکی کے سر پر الزام تھوپ کر وہ سزا سے بچ نکلے گا۔ بس یہی نہیں بلکہ اپنی خودنوشت ''اعترافات'' میں اس نے یہ بھی جتلایا ہے کہ وہ اس زمانے میں بالغ نہیں تھا۔ محض بچہ تھا۔ یہ گویا دوسرا عذر ہے۔ وہ ہم کو یقین دلانا چاہتا ہے کہ یہ ایک بچگانہ حرکت تھی۔ مگر یہ سفید جھوٹ ہے۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تو اس کی عمر سترہ یا اٹھارہ برس تھی وہ کسی طور پر بچہ نہ تھا۔

خیر ہم یہاں بھی بتا دیں کہ اس بہتان طرازی نے اس کو عمر بھر چین نہ لینے دیا۔ لمبی بے خواب راتوں میں کئی بار اس کو گمان گزرتا کہ بدقسمت میرین اس کو ملامت کرنے آئی ہے۔ برسوں کے بعد بھی یہ ظلم اس کی یادوں میں یوں تازہ رہا جیسے کل کی بات ہو۔ روسو سوچتا تھا کہ اس واقعہ کی اذیت ناک یادوں سے جو دکھ اس نے اٹھائے ہیں، شاید ان سے کسی حد تک جرم کا مداوا ہو جائے۔

سالہا سال بعد اس نے کہا تھا کہ ''اعترافات'' رقم کرنے کا اولین سبب یہی واقعہ ہے۔

زندگی کی جدوجہد

روسو خود کو جھوٹا اور بہتان طراز ثابت کر چکا تھا۔ جلد ہی وہ اپنے آپ کو احمق ثابت کرنے والا تھا۔

مادام دے ورسائے کی موت کے چھ ہفتے بعد اس کو ایک اور جاگیردار سولار خاندان میں ملازمت مل گئی۔ خدا جانے اس خاندان کے افراد کو روسو کے کرتوت کا پتہ تھا یا نہیں لیکن چند ہی روز میں وہ لوگ یہ ضرور جان گئے کہ ان کا یہ ملازم دوسرے نوکروں سے مختلف ہے اور یہ کہ وہ لکھنے پڑھنے کا ذوق رکھتا ہے۔ اس خاندان کے ایک صاحب ایبے دی گوراں نیک دل اور نفیس طبع تھے۔ انہوں نے روسو کو اپنا سیکرٹری بنا لیا۔ با قاعدہ سیکرٹری تو شاید ہم نہیں کہہ سکتے۔ بس یوں سمجھئے کہ انہوں نے مستقبل کے اس نامور فلسفی کو اپنے سیکرٹری کا سا درجہ دے دیا تھا اور اس کی تعلیم پر بھی توجہ دینے لگے۔ وہاں وہ لاطینی زبان میں مہارت حاصل نہ کر سکا، البتہ اطالوی زبان پر اس کو اچھا خاصا عبور حاصل ہو گیا۔

یہ سلسلہ جاری رہتا تو روسو کی شخصیت اور بھی نکھر جاتی مگر باپ کی طرح وہ بھی لڑنے بھڑنے کا عادی تھا۔ اس کی جھگڑالو طبیعت رنگ لائی اور سولار خاندان نے اس کو ملازمت سے نکال دیا۔ یوں اپنی حماقت کے باعث اس نے ایک اچھا موقع کھو دیا۔ ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد وہ اس قصبے کے بیلکر نامی ایک لفنگے کے ساتھ جنیوا کی طرح پیدل چل پڑا۔ یہ لگ بھگ پونے تین سو میل کا سفر تھا۔ راستے میں جب وہ اما سے کے قریب پہنچے تو روسو کو خیال آیا کہ وہ ایک بار پھر مادام دے وارین کے سائے میں پناہ لے سکتا ہے اور یہ کہ لفنگے بیلکر کو وہاں ساتھ لے جانا مصلحت کے خلاف ہو گا۔ چنانچہ وہ ہم سفر سے نظریں پھیرنے لگا۔ ایک دن آنکھ چرا کر بھاگ نکلا اور سیدھا مادام کے ہاں جا

پہنچا۔

مادام دے وارین کا ذکر ہم گزشتہ باپ میں کر چکے ہیں اور آگے چل کر بھی اس کا چرچا ہوتا رہے گا۔ روسو کا کوئی تذکرہ اس خاتون کے حوالے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا جس نے زندگی کے کئی مرحلوں پر روسو کی مدد کی تھی اور اس کی شخصیت کو متاثر بھی کیا تھا تو آیئے ہم جان مورلے کی مدد سے اس خاتون کے بارے میں چند باتیں جان لیں۔

مادام کے بارے میں جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ روسو سے بارہ سال بڑی تھی۔ اوائل شباب میں اس کا بیاہ ہوا مگر میاں بیوی میں نباہ نہ ہو سکا۔ چنانچہ شادی کے چند سال بعد وہ گھر بار کے ساتھ اپنا پروٹسٹنٹ مذہب بھی چھوڑ کر جنیوا بھاگ گئی۔ یہاں اس نے کیتھولک عقیدہ قبول کر لیا۔ ان دنوں جنیوا کی جھیل کے کنارے سارڈینیا کا بادشاہ ٹھہرا ہوا تھا جو تنگ نظر کیتھولک تھا۔ اس کو مادام کے مذہب کی تبدیلی کا علم ہوا تو وہ بہت خوش ہوا۔ وہ مادام کو مبارک باد دینے اس کے گھر گیا اور عمر بھر کے لیے اس کو چھوٹی سی رقم کے وظیفہ کا تحفہ دے آیا۔

مادام کوئی عام سی عورت نہ تھی۔ اس میں کئی خوبیاں تھیں۔ وہ پرکشش عورت تھی اور اطوار اس کے پسندیدہ تھے۔ مذہب سے اس کا تعلق بس واجبی سا تھا۔ ممکن ہے کہ کسی مذہبی سبب کے بجائے اس نے خاوند سے چھٹکارا پانے اور چند مادی فائدے حاصل کرنے کی خاطر عقیدہ بدلا ہو۔ خیر وہ لالچی عورت ہرگز نہ تھی۔ وہ غریبوں کی ہمدرد تھی۔ بدقسمت لوگوں کے لئے اس کا دل محبت اور رحم سے بھرا ہوا تھا۔ لوگ ناشکرے ہوتے یا اس کو پریشان کرتے تو معاف کر دیتی اور دل میں کوئی کدورت نہ رکھتی تھی۔

ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ غیر محتاط، خوش باش اور جنسی محبتوں پر یقین رکھنے والی خاتون تھی۔ کئی ملازموں کو اس کے ساتھ ہم بستری کا موقع مل جاتا۔ روسو نے ایک جگہ کردار کے اس جھول کی توجیہہ کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ مادام رے وارین ملازموں کو اپنا زیادہ سے زیادہ وفادار رکھنے کی خاطر یہ طرزعمل اختیار کرتی تھی۔ محض جنسی رنگ رلیاں اس کا مقصد نہ تھا۔ روسو سے بھی اس کا جنسی تعلق رہا۔ پھر اس کی جگہ ایک گھٹیا قسم کے لمبے تڑنگے نوجوان کو ملی جو ایک حجام کا شاگرد رہ چکا تھا۔ اس اوباش شخص کی فضول خرچیوں نے مادام کو بہت نقصان پہنچایا اور وہ مالی مصائب میں مبتلا ہوگئی۔

یہ اطلاع روسو نے دی ہے، ہم یقین کر سکتے ہیں کہ رقابت کے احساس نے اس دعویٰ میں مبالغہ پیدا کر دیا ہو گا۔ بہر حال اگر اس ملازم نے مادام کی نوازشوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا تھا تو روسو نے بھی یہی کچھ کیا۔ وہ مادام کی پناہ میں رہا۔ اس سے مالی فائدے حاصل کئے اور جنسی لطف بھی اٹھائے لیکن بعد میں اس نے یہ ساری باتیں قلمبند کر ڈالیں اور آنے والی نسلوں کے لئے اس کو مکروہ اور بدکار عورت بنا دیا۔ ان باتوں کا تذکرہ اس نے اپنی سوانح عمری ''اعترافات'' میں کیا ہے۔ یہ بجا ہے کہ وہ 1800 سے پہلے اس کتاب کی اشاعت نہ چاہتا تھا لیکن وہ 1788ء میں منظر عام پر آ گئی۔ اس زمانے میں روسو اور مادام دونوں اس جہان فانی سے گزر چکے تھے مگر مادام کے عزیز و اقارب زندہ تھے۔ یہ کتاب ان کی رسوائی کا سبب بنی۔

شاید ہم روسو کی ناشکری کا تھوڑا بہت کفارہ ادا کر سکتے ہیں اور مادام رے وارین کے دفاع میں ایک آدھ بات کہہ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم یہ جتلا سکتے ہیں کہ اگر وہ جنسی رویوں کے اعتبار سے ہمارے اخلاقی معیاروں پر پورا نہ اترتی تھی تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے وطن کا ماحول نہ صرف ہمارے جیسے مشرقی بلکہ کئی یورپی ملکوں سے بھی مختلف تھا۔

بات یہ ہے کہ مادام دے وارین کے وطن سوئٹزرلینڈ میں جنسی آزادی کی تحریک پروٹسٹنٹ فرقے کو جنم دینے والی اصلاح مذہب کی تحریک کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی۔ سولہویں صدی کے جنیوا میں ایک عورت بہت نمایاں ہوئی۔ وہ یہ درس دیتی تھی کہ جب کوئی عورت کسی مرد کی جنسی تسکین سے انکار کرتی ہے تو اس کا رویہ ویسا ہی ظالمانہ ہوتا ہے جیسا کسی بھوکے کو روٹی اور پیاسے کو پانی سے محروم رکھنے والی کا ہوتا ہے۔

ایک لحاظ سے مادام دے وارین کی شخصیت والٹیئر کی محبوبہ، ایمیلی سے ملتی جلتی تھی۔ روسو کو 1729ء میں اس کے قریب آنے کا موقع ملا اور آوارہ گردی کے وقفوں کے ساتھ 1738ء تک اس کا تعلق قائم رہا۔ یہ اس کی زندگی کا تشکیلی دور تھا۔ مصنف کے طور پر اس کی شخصیت کی تشکیل میں ان برسوں نے اہم کردار ادا کیا۔ اس زمانے میں اس نے کتابی علم حاصل کیا اور بہت سے دنیاوی تجربات سمیٹے۔

خیر، روسو جب دوبارہ مادام دے وارین کے پاس پہنچا اور اس سے مدد چاہی تو

مادام نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک مذہبی تربیت گاہ میں داخل کروا دیا۔ وہ محنت اور لگن سے کام لیتا تو اس کی قابل رحم آوارہ گردی کے دن ختم ہو سکتے تھے اور وہ تربیت گاہ سے فارغ ہونے کے بعد کسی گاؤں یا قصبے میں پادری مقرر ہوسکتا تھا لیکن لاطینی زبان سیکھنا اس کے بس کا روگ نہ تھا اور مذہبی تعلیم و تربیت اس کے بغیر مکمل نہ ہوتی تھی۔ ان دنوں وہ موسیقی میں زیادہ دلچسپی لینے لگا تھا چنانچہ اس تربیت گاہ سے لوٹ آیا۔ یوں روسو موسیقی کا درس لینے لگا۔ یہ سلسلہ ایک سال تک قائم رہا۔ پھر وہ موسیقی سے بیزار ہو گیا۔ چنانچہ اس نے اپنے استاد کے ساتھ بھی دوسرے محسنوں جیسا سلوک کیا۔ ایک دن مرگی کے دورے کی وجہ سے موسیقار ایک گلی میں گرا تو روسو نے اس کو وہیں چھوڑا اور مادام کے گھر لوٹ آیا۔ مگر مادام پیرس جا چکی تھی۔

روسو اب کہاں جاتا؟

اس کا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہ تھا۔ روزگار کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ کوئی ہنر اس کے پلے نہ تھا۔ جو آگے پیچھے تھے۔ وہ ان کو بھلا چکا تھا۔ اس نے سوئٹزرلینڈ میں آوارہ گردی شروع کر دی۔ لگتا ہے کہ موسیقی کی لگن کم نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ مفلوک الحالی اور آوارہ گردی کے ان ایام میں اس نے اپنا نام بدلا اور فرانسیسی موسیقار کا روپ دھار لیا۔ لوزین کے شہر پہنچ کر اس نے میوزک ماسٹر بن کر رہنے کی ٹھانی۔ موسیقی میں اس کو معمولی شد بد تھی۔ پیشہ ور موسیقار بننے کے لئے جس علم اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اس سے محروم تھا پھر بھی اس نے ایک دھن بنائی اور قانون کے ایک پروفیسر کے گھر کی بڑی تقریب میں موسیقی کا کمال دکھانے چلا گیا۔ آرکسٹرا کی رہنمائی بھی وہ خود ہی کر رہا تھا۔ معزز پروفیسر کے مہمانوں نے جب اس کی اوٹ پٹانگ موسیقی سنی تو شور مچانے لگے۔ تب اس کو پھسڈی ہونے کا اقرار کرنا پڑا۔

اس شرمناک توہین کے بعد روسو نے سنجیدگی سے موسیقی سیکھنے کی کوشش کی اور کچھ نہ کچھ سیکھ بھی لیا۔ شاید وہ پیشہ ور موسیقار بن جاتا مگر ہوا یہ کہ لوزین میں انہی دنوں ایک اور دغا باز آ نکلا۔ اس نے روسو کو اپنا سیکرٹری اور ترجمان بننے پر آمادہ کر لیا۔ یہ شخص یونانی مشنری کے روپ میں آیا تھا۔ خود کو یونانی کلیسا کا راہب جتلاتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ مذہبی درسگاہوں کی مرمت اور دیکھ بھال کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض سے آیا ہے۔ دونوں نے مل کر

لوگوں سے کچھ رقم بٹوری لیکن فرانسیسی سفیر ٹھگ مشنری کی اصلیت جان گیا۔ اس پر ٹھگ جان بچانے کے لیے بھاگ گیا اور سفیر روسو کو اپنے گھر لے گیا۔ اس کو مستقبل کے اس فلسفی کی کوئی ادا پسند آئی تھی۔ چنانچہ اس نے روسو کو ملازم رکھ لیا اور کسی کام کی غرض سے پیرس بھیج دیا۔

ستمبر 1731ء میں روسو پیرس سے واپس آ رہا تھا تو اس نے چیمبری کے مقام پر مادام دے وارین کو ڈھونڈ لیا۔ مادام ایک بار پھر محبت اور شفقت سے پیش آئی مگر اس کے حالات سے پہلے سے نہ رہے تھے۔ روسو اس کے بیزار کن حد تک بوسیدہ گھر کے ایک تنگ و تاریک کمرے میں رہنے لگا۔ وہ بار بار مادام کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ جب کبھی اس کو ٹھکانہ اور سکون درکار ہوتا، وہ مادام کا رخ کرتا تھا۔ صاف طور پر لگتا ہے کہ اس نے دل ہی دل میں مادام کو ماں کا روپ دے رکھا تھا۔ وہ ماں کی محبت سے محروم رہا تھا۔ مادام کے سائے میں آ کر اس محرومی کا مداوا چاہتا تھا۔ اس چاہت میں جنسی جذبہ بھی کارفرما تھا۔ اب اس جذبے کو اظہار کا موقع ملنے لگا۔ چیمبری میں پہلی بار اس کو مادام سے، جس کو وہ ماں کہہ کر پکارتا تھا، جنسی ربط کا موقع ملا۔

مادام کی سفارش پر روسو کو چیمبری میں ارضی سروے کے سرکاری محکمہ میں ملازمت مل گئی۔ وہ کلرک بن گیا۔ ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس جیسے لاپروا نوجوان پر اس ملازمت سے کیا گزری ہو گی جو راتیں کھلے آسمان تلے اور دن جنگلوں کی سیر بن کر گزارنے کا عادی تھا۔ روزانہ اس کو آٹھ گھنٹے گندے اور بے ہودہ ساتھیوں کے ساتھ ایک کمرے میں بیٹھ کر دفتر کا حساب کتاب کرنا پڑتا تھا۔ جلد ہی وہ اکتا گیا اور بھاگ نکلا۔

مادام نے اس دوران عاشق بدل لئے تھے۔ روسو لوٹا تو مادام نے اس کو چیمبری کے قریب ایک گاؤں میں بھیج دیا جہاں مادام کا ایک چھوٹا سا فارم تھا۔ روسو نے اس ویرانے میں گزرے ہوئے دنوں کے بارے میں کئی قصے کہانیاں گھڑی تھیں۔ وہاں روسو کو ایک جاگیردار کے بچوں کو پڑھانے کا کام سونپا گیا مگر وہ اس کام کے قابل نہ تھا۔ لہٰذا یہ کام زیادہ دن جاری نہ رہا۔ اس علاقے میں روسو نے کئی سال گزارے اور وہ رائیگاں نہ گئے۔ باقاعدہ تعلیم سے محروم رہا تھا۔ یہاں اس نے بہت سا مطالعہ کیا۔ اپنے آپ کو تعلیم دی۔ کئی کتابوں اور علوم کا توجہ سے مطالعہ کیا۔ کتابوں کے ضروری حصوں کو وہ اپنی نوٹ بکس میں درج کرتا

رہا جو بعد میں اس کے لئے ''خیالات کا گودام'' ثابت ہوئیں۔ یہیں اس نے سائنسی علوم میں دلچسپی لی۔ جیومیٹری کی مشقیں، کیمسٹری کے تجربے کئے۔ یہاں تک کہ فلکیاتی مشاہدے بھی کر ڈالے۔ پھر اس نے موسیقی سیکھی جس سے اس کو پیدائشی لگاؤ تھا لیکن اس فن میں باقاعدہ تعلیم و تربیت سے محروم رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے میں رہتے ہوئے وہ موسیقی اور ادب کے شعبوں میں کیریئر بنانے کی تیاری کر رہا تھا۔

1741ء میں اس نے قسمت آزمانے کے لئے پیرس جانے کا ارادہ کیا۔ وہ اپنا سارا علم لئے نکلا۔ چودہ سال پہلے جس طرح وہ جنیوا سے بھاگ آیا تھا، اب بھی ویسے ہی فرار ہوا۔ اس کو لگتا تھا کہ مادام کی زندگی میں اس کو پہلے جیسا مقام حاصل نہیں رہا۔ پیرس جاتے ہوئے اس کے پاس موسیقی کی نوٹیشن کا وہ نظام تھا جو اس نے خود ایجاد کیا تھا۔ ایک ڈرامہ اور چند نظمیں بھی تھیں۔ پیرس وہ شہر ہے جو اٹھارہویں صدی میں ایک عرصے کے لیے دنیا کا مرکز بن گیا تھا۔ وہاں موسیقی، تھیٹر، رقص اور ادب کی دھوم تھی۔ صاحبان کمال کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ مگر ہمارے روسو کے لیے یہ شہر ظالم اور بے نیاز ثابت ہوا۔ وہاں روسو کو کسی نے گھاس نہ ڈالی۔ وہ پیرس کی اکادمی پہنچا اور موسیقی کے نئے نظریے پر ایک مقالہ اکادمی کے علماء و فضلاء کی خدمت میں پیش کیا۔ ان صاحبان کی ایک کمیٹی نے اس مقالے کا جائزہ لیا اور رد کر دیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان صاحبان میں سے کوئی بھی موسیقی کا ماہر نہ تھا۔

دنیا نے جو بے انصافیاں روسو کے ساتھ کی تھیں، ان کی طویل فہرست میں ایک اور شدید قسم کی بے انصافی کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا ڈرامہ سٹیج پر پیش کرنا چاہا مگر کسی پروڈیوسر نے اس میں دلچسپی نہ لی۔ خیر اس کی جیب میں چند سکے تھے جو اس کو مستقبل کی فکر سے محفوظ رکھنے کے لئے کافی تھے۔ انہیں دنوں ایک دوست نے روسو کو چند بااثر خواتین سے ملوایا۔ ان میں سے دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک کا نام مادام دے کرنترے تھا اور دوسری دوپاں تھیں۔ روسو کو اپنی تیرہ بختی پر لکھی ہوئی نظمیں سناتا اور وہ تعریف کرتیں جب وہ چاہتا اس کو کھانے پر بلوا لیا جاتا۔ ان دونوں خواتین کے گھروں میں اس کو پیرس کی بعض ممتاز شخصیتوں، ادیبوں، سائنسدانوں اور موسیقاروں سے ملنے کا موقع ملا۔ ان افراد میں جواں سال دیدرو بھی شامل تھا جو چند برس بعد پیرس سے شائع ہونے والے شہرہ آفاق

انسائیکلو پیڈیا کا ایڈیٹر بننے والا تھا۔ دونوں دوست بن گئے۔

مادام دوپاں جلد ہی روسو کے ساتھ اچھا سلوک کرنے لگی۔ وہ فرانس کے امیر ترین افراد میں سے ایک کی بیٹی اور دوسرے کی بیوی تھی۔ روسو کو اپنی دکھ بھری زندگی کی نظمیں سناتا رہا اور پھر ایک روز اس نے محبت نامہ بھی لکھ بھیجا۔ ہوسکتا ہے کہ مادام نے اس کو گستاخی سمجھا ہو لیکن شاعر کی طرف سے محبت کے اظہار پر وہ خوش بھی ہو گی۔ بہرطور سوانح نگاروں کا کہنا ہے کہ اس مہربان خاتون نے شاعر کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ اس کو وینس میں اپنے ملک کے سفیر کے سیکرٹری کا عہدہ بھی دلوا دیا۔

1743ء کے موسم بہار کے دن تھے۔ جب وہ آوارہ گرد شاعر نئی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے وینس روانہ ہوا۔ فرانس یورپ کا بڑا ملک اور وینس ایک اہم دارالحکومت تھا لہٰذا ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہاں کا فرانسیسی سفیر کوئی مدبر شخص ہو گا لیکن عظمت کے باوجود اس زمانے کے، یعنی اٹھارہویں صدی کے درمیانی عرصے کے بادشاہ لوئی کے زمانے کے فرانس کی حکومت کے انتخاب ویسے ہی غیر ذمہ دارانہ ہوا کرتے تھے جیسے آج کل کے زمانے میں ہماری حکومتوں کے ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ وینس میں متعین فرانسیسی سفیر، کاؤنٹ آف مونیگو نکھدا اور نکما شخص تھا۔ وہ سفارت کاری کی اہلیت سے کوسوں دور تھا۔ اس نے سفارت خانے کے کام کا سارا بوجھ روسو کے کندھوں پر ڈال دیا، تاہم روسو نے خلاف توقع ذمہ داری کا ثبوت دیا اور عمدگی سے فرائض ادا کرنے لگا۔

سفیر صاحب کی بعض عادتیں بہت عجیب و غریب تھیں۔ مثلاً وہ ہمیشہ اپنے لئے دو کے بجائے تین جوتے بنواتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ دو میں سے ایک جوتا جلد خراب ہو جائے تو پورا جوڑا ناکارہ ہوجاتا ہے لہٰذا دو کے بجائے تین جوتے بنوانے چاہئیں۔ ایک اور خصوصیت اس کی یہ تھی کہ ماتحتوں کے کام سے کبھی خوش نہ ہوتا تھا۔ روسو کے ساتھ اس کی بن نہ سکی۔ جلد ہی دونوں میں جھگڑے شروع ہو گئے۔ آخر کار سفارت خانے کے ناسازگار ماحول میں اٹھارہ ماہ گزارنے کے بعد وہ 1744ء کے آخری دنوں میں پیرس لوٹ آیا۔

روسو اس امید پر لوٹا تھا کہ وہ اپنی مہربان خواتین سے ملے گا اور ان کی مدد سے کوئی اور اچھی ملازمت حاصل کر لے گا۔ مگر اشرافیہ سے تعلق رکھنے والی ان خواتین نے منہ پھیر لیا۔ وہ روسو کی دوبارہ مدد کرنے پر تیار نہ تھیں۔ لگتا ہے کہ روسو کو اس رویے سے رنج

پہنچا اور وہ امراء کے خلاف باتیں بنانے لگا۔

پیرس میں انہی دنوں اس کے ڈرامے ''میوزے دی گالانٹ'' کے بعض حصے مادام دے لاپوپے لانس کے سلون میں کامیابی سے کھیلے گئے۔

بت دہقان

انہی دنوں ہمارے فلسفی کی زندگی میں ایک عورت داخل ہوئی۔ دوست اس عورت کے ساتھ ملاپ کو روسو کی بدقسمتی شمار کرتے تھے۔ تاہم اس کا اپنا اندازِ فکر بالکل مختلف تھا۔ وہ اس ملاپ کو اپنی چند خوش قسمتیوں میں شمار کرتا اور کہتا کہ اس واقعہ کی وجہ سے اس میں زندگی کے حوادث و مصائب برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ عمر بھر اسکی رائے نہیں بدلی۔

یہ قصہ یوں ہے کہ پیرس آنے پر روسو ایک گھٹیا سے ہوٹل میں رہنے لگا۔ اس کا نام ''ہوٹل ایس ٹی کوئنتاں'' تھا۔ (یہ ہوٹل روسو کی وفات کے ایک عرصے بعد تک قائم رہا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ اب بھی موجود ہے یا نہیں لیکن جب جان مورلے کی دو جلدوں پر مشتمل کتاب ''روسو'' کا 1905ء کا ایڈیشن شائع ہوا تو اس نے لکھا تھا کہ یہ ہوٹل موجود ہے اور اس کا نام بدل کر ''ہوٹل جے جے روسو'' رکھ دیا گیا ہے۔) جواں سال روسو کی اس ہوٹل میں ایک غریب لڑکی ٹریزے والیسور سے ملاقات ہوئی جو ہوٹل کی ملازمہ تھی۔ وہ اورلینز کے علاقے کی رہنے والی تھی جہاں اس کا باپ ٹیکسٹائل میں کام کرتا رہا تھا اور ماں ایک دیہاتی دکان چلاتی تھی جس زمانے کی ہم بات کر رہے ہیں، ان دنوں ماں باپ دونوں روزگار سے محروم ہو چکے تھے اور وہ ٹریزے کی معمولی آمدنی پر گزارہ کر رہے تھے۔

جب روسو نے پہلی بار ٹریزے کو دیکھا تو وہ مالکن اور اس کے مہمانوں کی خدمت کر رہی تھی۔ وہ معمولی شکل وصورت کی دوشیزہ تھی۔ اعترافات میں روسو ہم کو یقین دلاتا ہے کہ اس نے اس دوشیزہ کو قابل رحم حالت میں دیکھا تھا۔ یوں اس کے دل میں ٹریزے کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو گیا۔ یہ گوشہ ہمیشہ قائم رہا۔

ٹریزے کو دیکھ کر روسو نے جانا کہ وہ سیدھی سادی دوشیزہ ہے۔ ٹریزے واقعی

سیدھی سادھی اور سادہ لوح تھی۔ اس قدر سادہ لوح کہ کوشش کے باوجود عمر بھر اس کو گھڑی دیکھ کر وقت بتانا نہ آیا۔ نہ ہی وہ کبھی سال کے مہینوں کے نام ترتیب سے یاد کر سکی۔ وہ ہمیشہ بھول جاتی کہ جنوری کے بعد فروری کا مہینہ آتا ہے اور ستمبر گزر جائے تو اکتوبر شروع ہو جاتا ہے۔ یہ بات بھی کبھی اس کے ذہن میں نہ اتر سکی کہ چار اور چار میں دو کا اضافہ کر دیا جائے تو دس بن جاتے ہیں۔ اس کی باتیں فضول اور بے ربط ہوتیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی اور کچھ اور کہہ دیتی تھی۔

پہلی ملاقات مارچ 1745ء میں ہوئی۔ روسو نے ٹریزے کو دیکھا۔ اسکی محبت میں مبتلا ہوا اور اس کی بت طناز کو گھر سے اٹھا لایا۔ دونوں اکٹھے رہنے لگے۔ وہ میاں بیوی کی طرح رہتے تھے لیکن ان کی باقاعدہ شادی نہیں ہوئی تھی۔ بائیں تیئس سال بعد 1768ء میں جب دونوں بڑھاپے کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے تو انہوں نے باقاعدہ شادی کی لیکن اس سارے عرصے کے دوران روسو کو بیوی، شریک حیات اور گھر کی مالکن کا درجہ دیتا رہا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ روسو کے گھر میں اکیلی نہیں آئی تھی۔ اس کے ماں باپ دونوں اس کے ساتھ آئے تھے اور وہ اپنی موت تک روسو کے پاس ہی رہے۔ روسو ان دونوں مطالبوں اور خاص طور پر ٹریزے کی ماں کی چالاکیوں کی وجہ سے پریشان رہا مگر وہ کسی نہ کسی طور ان کا بوجھ اٹھائے چلا گیا۔

ٹریزے نے پانچ بچوں کو جنم دیا۔ یہ بچے 1746ء سے 1754ء کے دوران پیدا ہوئے لیکن ان سب بچوں کو یتیم خانے میں داخل کروا دیا گیا۔ یہ ایک ایسا فعل تھا جس کی تکلف خود روسو کو بھی بعد میں بری طرح محسوس ہوتی رہی اور وہ اس پر آہ و بکا کرتا رہا۔ اس نے اپنے اس فعل کی کئی تاویلیں کی ہیں لیکن ان ساری تاویلوں سے نہ اس کو تسلی ملی اور نہ ہی دوسرے لوگ مطمئن ہو سکے۔ تعلیم کے موضوع پر اپنی کتاب ''ایمیل'' میں اس نے لکھا ہے کہ ''جو شخص باپ کے فرائض ادا کرنے کے قابل نہ ہو اس کو ہرگز باپ نہیں بننا چاہیے۔ غربت، کام کی زیادتی یا لوگوں کا خوف............غرض کوئی ایسی بات نہیں جو باپ کو اپنے بچوں کی پال پوس اور ان کی تعلیم و تربیت کے فرض سے آزاد کر سکے۔ میری کتاب کے پڑھنے والو! میری بات کا یقین کرو۔ میں ہر اس شخص کو بتائے دیتا ہوں جس کے سینے میں دل ہے اور جو پھر بھی ان مقدس (یعنی باپ کے طور پر اپنے فرائض) ادا نہ کرنے پر خون

کے آنسو روئے گا اور اس کے دل کو کبھی چین نہ ملے گا۔''

ڈاکٹر محمود حسین لکھتے ہیں کہ روسو اور اس کے حامیوں نے روسو کی طرف سے اپنے بچوں کو یتیم خانے میں داخل کروانے کی بہت سی توجیہات کی ہیں مگر ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جو دل کو لگ سکے۔ روسو کی زیادتی ہے کہ وہ اپنے اس طرز عمل کو غریب افلاطون کے سر تھوپتا ہے کہ اس نے اپنی کتاب ''ریاست'' میں اس کا مشورہ دیا ہے۔ روسو کا یہ خیال بھی محض بہانہ ہے کہ یتیم خانے میں بچے گھر سے بہتر تعلیم پا کر نہایت محنتی کاشتکار بنیں گے اور ایمانداری کے ساتھ روزی کمانا سیکھیں گے واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ایسے اداروں سے جو بچے بڑھ کر نکلتے، وہ جرائم پیشہ اور کسبیوں کے طبقہ میں شامل ہوتے تھے۔ روسو کی صفائی پیش کرنے والوں کا یہ خیال بھی بے معنی ہے کہ روسو ایسا کرنے میں اس وجہ سے حق بجانب تھا کہ وہ بچے دراصل اس کے تھے ہی نہیں۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ اگر یہ بات درست ہوتی تو اپنے ''اعترافات'' میں جہاں اس نے کچھ بھی نہیں چھپایا ہے، وہاں وہ اس امر کی طرف بھی اشارہ ضرور کر دیتا، تاہم اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ الزام درست ہے تو اس عورت کے قطع تعلق کے لیے یہ معقول اور کافی وجہ ہوسکتی تھی۔ مگر غریب بچوں کا بھلا اس میں کیا قصور تھا۔ روسو کا معاملہ یہ ہے کہ بچوں کی ماں کو وہ اپنے لئے دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھتا رہا اور خود بچوں کو یتیم خانے کی طرف دھکیل دیا۔

واقعی ایسی کوئی تاویل تلاش کرنا دشوار ہے جس کے ذریعے روسو کے اس طرز عمل کو جواز دیا جا سکے، تاہم چند سال پہلے جیک ہورڈ بروم نے ''روسو: اس کے فکر کا ایک مطالعہ'' کے عنوان سے اپنی کتاب میں یہ رائے دی ہے کہ بچوں کو یتیم خانے میں داخل کروانا محض فسانہ ہے جو ٹریزے نے اپنی ماں کے ساتھ مل کر ہمارے فلسفی کو بے وقوف بنانے کے لیے تراشا تھا۔ بروم صاحب کا کہنا یہ ہے کہ ٹریزے بانجھ تھی اور اس کے بطن سے کسی بچے نے جنم نہ لیا تھا۔ وہ حمل اور پیدائش کا ڈھونگ روسو کو باوقار رکھنے کے لئے رچاتی اور پھر اعلان کر دیتی کہ اس نے نومولود کو یتیم خانے میں داخل کروا دیا ہے۔ سادہ دل روسو اس کی بات پر یقین کر لیتا۔

روسو کی زندگی پر گہری تحقیق کرنے والا کوئی محقق ہی بروم صاحب کے دعویٰ کو درست یا غلط ثابت کرسکتا ہے، تاہم یہاں ہم ایک بات کہہ سکتے ہیں کہ جو چیز بظاہر اس

دعویٰ کی تائید کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ خود روسو نے اپنی خودنوشت میں یہ لکھا ہے کہ ان پانچ بچوں میں سے کسی ایک کو بھی اس نے خود نہیں دیکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ عجیب اور مشکوک سا معاملہ بن جاتا ہے کہ باپ بچوں کی شکل تک نہیں دیکھتا اور واویلا کرتا ہے کہ اس نے بچوں کو یتیم خانے میں پھینک دیا تھا۔

بچوں کا معاملہ جو بھی ہو، یہ البتہ درست ہے کہ ٹریزے کے ساتھ روسو زندگی بھر مطمئن رہا تھا۔ ایک دو اور بھی عورتیں اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھیں مگر ان کے ساتھ تعلق محض رومانوی قسم کا رہا تھا۔ ایک جگہ اس نے صاف صاف لفظوں میں ہم کو جتلایا ہے کہ ''اپنی ٹریزے کے ساتھ میں نے ایسی خوشگوار زندگی گزاری ہے کہ جیسے دنیا جہان کے کسی نفیس ترین نابغہ کے ساتھ بسر ہوئی ہو۔''

اصل میں دونوں کو سخت اور کھردری زندگی کی عادت تھی۔ جہاں تک روسو کا تعلق ہے۔ اس کو سادہ لوگوں کی کرختگی اور کنوارا پن اچھا لگتا تھا اور ٹریزے اس کی عمدہ مثال تھی۔ ظاہر ہے کہ ان کا باہمی رشتہ کسی وقت بھی توڑا جا سکتا تھا مگر ہمارا فلسفی آخری دم تک اس کے ساتھ وابستہ رہا۔ روسو کے دوست اس کی محبوبہ کو گنوار، لالچی، حاسد اور سوقیانہ ٹھہراتے تھے لیکن ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان دوستوں کو ٹریزے میں جو خوبیاں نظر آتی تھیں، خود روسو کو ان کی تلاش ہی نہ تھی اور جو کچھ وہ ٹریزے میں دیکھتا تھا، وہ اس کے دوستوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتا تھا۔ برسوں تک ساتھ رہنے کے بعد جب روسو پر شریک حیات کی خوبیاں اور خامیاں اجاگر ہو چکی ہوں گی، اس نے لکھا تھا کہ ''میری ٹریزے کا دل کسی فرشتے کے دل جیسا ہے۔ قربت کے ساتھ ساتھ ہماری وابستگی بڑھتی گئی اور روز بروز ہم کو اس امر کا زیادہ یقین ہوتا چلا گیا کہ ہم بنے ہی ایک دوسرے کے لیے تھے۔ اگر ہماری خوشیاں بیان کی جا سکیں تو شاید آپ ہنس دیں گے۔ شہر کے ہنگاموں سے دور ہمارے سیر سپاٹے، گھر میں کھڑکی کے پاس ہم دونوں کا صندوق پر رکھی ہوئی دو کرسیوں پر روبرو بیٹھ کر شام کا کھانا تناول کرنا............ یہ تھیں ہماری سادہ سی خوشیاں۔ کھڑکی ہمارے لئے میز کا کام دیتی۔ ہم تازہ ہوا میں سانس لیتے۔ گردوپیش کا منظر دیکھتے رہنا، لوگوں کو آتے جاتے دیکھنا، چوتھی منزل پر کھانا کھاتے ہوئے نیچے گلی میں جھانکنا............ کون ان کھانوں کو بیان کرے گا اور کون ان کا لطف محسوس کرے گا۔ کبھی کبھی وقت کو خاطر میں لائے بغیر ہم آدھی آدھی رات

تک یونہی بیٹھے رہا کرتے تھے۔"

زندگی ہمیشہ ایک ڈگر پر نہیں چلتی نہ ہی دن سدا ایک سے رہتے ہیں۔ وقت کے ساتھ روسو کے یہ دن بھی بدلنے لگے۔ وہ وقت آ گیا جب اس کو ٹریزے کے رویے بدلتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ سولہ سترہ برس کی رقابت کے بعد اس نے لکھا کہ "مجھے لگتا ہے کہ ٹریزے میرے لئے ویسی نہیں رہی جیسی کہ ہماری خوشیوں کے زمانہ میں تھی۔ مجھے یہ احساس اس لیے زیادہ ہوا کہ میں اب بھی اس کے لیے پہلے جیسا تھا۔"

روسو ہم کو یقین دلاتا ہے کہ وہ فاصلے بڑھانے لگی تھی اور بے نیاز ہوتی جا رہی تھی۔ یہ تبدیلی باقاعدہ شادی کے فوراً بعد نمایاں ہوئی۔ شاید یہ عورت کی نفسیات کا حصہ ہے۔کم از کم کرشن چندر کی رائے یہی ہے۔ اس نے ایک افسانے میں ایک مرد اور عورت کا حال لکھا ہے جو نکاح کے بغیر مل کر رہتے تھے اور عورت دل و جان سے اپنے ساتھی کی خدمت کرتی تھی لیکن مرد کی ماں جب بھی آتی وہ ان دونوں کو نکاح کی تلقین کرتی۔ آخر کار ماں کی ملامتیں اور نصیحتیں رنگ لے آئیں۔ انہوں نے باقاعدہ بیاہ کر لیا۔ دوسرے ہی روز عورت کے رویے بدل گئے اور کیوں نہ بدلتے۔ اب وہ ساتھی نہ رہی تھی بیوی بن گئی تھی اور بیوی بالادستی چاہتی ہے۔

خیر، ہم ٹریزے کی طرف واپس چلیں۔ 1776ء میں یعنی شادی کے لگ بھگ ایک سال بعد وہ روسو سے الگ ہونے پر بھی تیار ہو گئی تھی۔ ہم کو ایسی تبدیلی کے اسباب کا واضح طور پر علم نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے پاس کوئی معقول جواز موجود ہو۔ البتہ ہم دو اسباب کو گمان میں لا سکتے ہیں۔ اول یہ کہ روسو سے اس کے بطن سے پیدا ہونے والے بچوں کو (اگر وہ واقعی وجود رکھتے تھے تو) یتیم خانے میں داخل کروا دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ماں کے لیے اس سے زیادہ صدمے کی بات نہیں ہوسکتی۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ روسو نے اس کے باپ کو بھی جبکہ وہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا، ایک خیرات گھر میں بھیج دیا۔ یہاں ایک اور وجہ بھی ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب روسو لکھنے پڑھنے کا کوئی کام شروع کرتا تو ہفتوں تک بیوی سے بے نیاز رہتا۔ یہاں تک کہ اس کے ساتھ کلام بھی نہ کرتا تھا۔

شادی کے بعد کئی سال روسو کے لئے بدقسمتی کے سال تھے۔ وہ بوڑھا ہو رہا تھا۔ بیماریوں نے اس کو گھیر لیا تھا۔ اس کی نفسیاتی کیفیت غیر متوازن ہو گئی تھی۔ وہ کئی وہموں

میں مبتلا تھا اور سمجھتا تھا کہ ساری دنیا اس کی دشمن بن گئی ہے اور چاروں طرف اس کو تباہ کرنے کی سازشیں ہو رہی ہیں۔ جو بظاہر دوست ہے، وہ بھی اصل میں دشمن ہیں اور ان سازشوں میں شریک ہیں۔ ان وہموں اندیشوں کے باوجود ٹریزے کے معاملے میں اس کا رویہ نہ بدلا۔ بدقسمتی کے تاریک دنوں میں نے ایک خط میں ٹریزے کو لکھا کہ ''26 سال سے تم میری محبوب ترین ہستی ہو۔ میں نے تمہارے سوا کہیں اور خوشی تلاش نہیں کی اور نہ ہی تم کو خوش وخرم رکھنے کی میری تگ و دو میں کوئی کمی آئی ہے۔''

پہلا مقالہ

ٹریزے کے ساتھ چلتے ہوئے ہم آگے نکل آئے ہیں، تو آیئے روسو کی داستان کا تسلسل قائم رکھنے کی خاطر واپس چلیں۔ جیسا کہ ہم نے گزشتہ باب میں کہا کہ ٹریزے کے ساتھ روسو کی پہلی ملاقات مارچ 1745ء میں ہوئی تھی جبکہ اس کی عمر 33 سال تھی۔ اگلے سال وہ مادام ڈیو پاں اور اس کے داماد کا سیکرٹری مقرر ہوا اور 1749ء میں اس نے پیرس کے آزاد خیال دانش وروں کے ایک حلقے کی طرف سے شائع ہونے والے انسائیکلو پیڈیا کے لیے موسیقی کے موضوع پر مقالات لکھنے شروع کیے۔ اس کا دوست دیدرو انسائیکلو پیڈیا کا مدیر تھا اور اسی نے روسو کو قلمی تعاون پر آمادہ کیا لیکن فرانس کے سیاسی اور مذہبی حکمرانوں کو دانشوروں کا یہ حلقہ اور انسائیکلو پیڈیا پسند نہ تھا۔ یہ لوگ نئے خیالات اور نئے علوم وفنون کو فرانس میں متعارف کروا رہے تھے اور حکمران ان باتوں کو اپنے لئے خطرناک سمجھتے تھے۔ آخر کار 24 جولائی 1749ء کو دیدرو کو ''اندھوں کے بارے میں ایک مکتوب'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھنے کی پاداش میں گرفتار کر کے ون سینے کے جیل خانے میں بند کر دیا گیا۔

اکتوبر کے مہینے میں روسو اپنے اس دوست سے ملاقات کی غرض سے جیل خانے کی طرف روانہ ہوا۔ اس مختصر سفر میں وہ بڑا واقعہ پیش آیا جس نے روسو کی کایا پلٹ دی اور اس کو وہ روپ دیا جس سے آج ہم آشنا ہیں۔

اس تقدیر ساز واقعہ کا ذکر روسو نے خود کیا ہے۔ تفصیل کے لئے ہم اسی سے رجوع کرتے ہیں۔ ''اعترافات'' میں وہ ہم کو بتاتا ہے کہ اکتوبر 1749ء کی ایک گرم سہ پہر کو وہ اپنے دوست سے ملنے جا رہا تھا۔ راستے میں اس کو اخبار کے ذریعے ایک انعامی تحریری مقابلہ کی اطلاع ملی۔ اس انعامی مقابلہ کا اعلان دویژون کی اکادمی نے کیا تھا جو اٹھارہویں صدی کے فرانس کے علمی اداروں میں نمایاں مقام رکھتی تھی اور ان تمام اکادمیوں سے پرانی

تھی جو دارالحکومت پریس سے باہر وجود میں آ گئی تھیں۔

مقابلہ کے لئے اکادمی نے ایک ایسا موضوع چنا تھا جس پر صدیوں تک بحث ہوتی رہی ہے اور ہمارے ہاں اب بھی اس پر گفتگو کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن وہ ایک ایسا موضوع ہے جس کے اثبات اور مخالفت میں بہت سے دلائل دیئے جا سکتے ہیں۔ وہ موضوع یہ تھا کہ آیا علم وفنون کی ترقی نے اخلاق سدھارنے میں مدد دی ہے یا ان کو بگاڑ دیا ہے۔

روسو لکھتا ہے کہ جونہی اس نے یہ خبر پڑھی تو اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے دل میں سینکڑوں چراغ روشن ہو گئے ہیں۔ خیالات کے ہجوم نے اس کے ذہن پر حملہ کر دیا۔ یہاں تک وہ نڈھال ہو گیا اور اس کو چلنے میں دشواری پیش آنے لگی۔ اس کیفیت میں وہ ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ لگ بھگ آدھے گھنٹے تک اس پر شدید جذباتی دباؤ طاری رہا۔ اس کے بعد ''جب میں اٹھا تو دیکھا کہ میری واسکٹ کا اگلا حصہ میرے آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔ مجھے کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ میں نے آنسو کب بہائے۔ آہ، میں سچ کہتا ہوں کہ اس درخت تلے میں نے جو دیکھا اور محسوس کیا تھا، اس کا چوتھا حصہ بھی میں معرض تحریر میں لانے میں کامیاب ہو جاتا تو میں اپنے سماجی نظام کے جملہ تضادات بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ علاوہ ازیں یہ امر بھی عمدگی سے بیان کر دیتا کہ انسان فطرت کے اعتبار سے نیک ہے۔ یہ ادارے ہی ہیں جنہوں نے اس کا ستیاناس کیا ہے۔''

اس نفسیاتی واردات کے بعد روسو نے سفر جاری رکھا۔ وہ بندی خانے گیا اور دیدرو سے ملا۔ اس کو اپنی واردات کا قصہ سنایا۔ دیدرو نے اس کو انعامی مقابلہ میں شریک ہونے اور اپنے خیالات کو قلمبند کرنے کو کہا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ دیدرو نے بھی یہ واقعہ بیان کیا ہے اور کم و بیش وہی باتیں دہرائی ہیں جو روسو نے لکھی ہیں تاہم بعض نقادوں نے اس واقعہ کے بارے میں دیدرو کے حوالے سے مختلف دعوے کئے ہیں۔ ہم ان کا ذکر اس باب میں آگے چل کر کریں گے۔

اس واقعہ کے بارے میں روسو نے اپنی سوانح حیات میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس ذہنی کیفیت کو کشف کا درجہ دیتا تھا۔ یہ گویا ایسا کشف تھا جس نے اکادمی کی طرف سے اٹھائے جانے والے سوال کا جواب اس کو دے دیا تھا۔ پھر جیسا کہ اس قسم کی نفسیاتی کیفیات سے حاصل ہونے والی بصیرتوں کی خاصیت ہے، روسو کو مکمل

یقین ہے کہ اس نے جو جواب حاصل کیا ہے، وہ ہر لحاظ سے مکمل اور حتمی ہے۔

روسو نے مقابلہ میں حصہ لینے کے لئے مقالہ لکھا اور اکادمی کو پیش کر دیا۔ اکادمی کی طرف سے اٹھائے ہوئے سوال کا اس نے جو جواب دیا وہ یہ تھا کہ علوم وفنون کی ترقی نے اخلاق وآداب تباہ کر دیئے ہیں۔

تہذیب وتمدن نے ہر جگہ انسانوں کو اخلاقی اور جسمانی اعتبار سے کمزور بنا دیا ہے۔ صرف وہی قومیں اور گروہ مضبوط ہیں اور نیکی کی راہ پر چل رہے ہیں جنہوں نے اپنی قدیم سادگی برقرار رکھی ہے لہٰذا سیدھی بات یہ ہے کہ علوم وفنون کے فروغ سے سماج گھاٹے میں رہتا ہے، اس سے بداخلاقی اور زوال کی قوتوں کو تصویت ملتی ہے۔

پنجاب یونیورسٹی میں فلسفے کے سابق پروفیسر ڈاکٹر سی اے قادر مرحوم نے اس مقالہ پر عالمانہ بحث کی ہے تو آیئے ہم ان کے تجزیے سے فائدہ اٹھائیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ روسو اپنے اس تصور کو تاریخی حوالے سے ثابت کرتا ہے وہ جتلاتا ہے کہ علوم وفنون کے فروغ اور قوموں کے زوال کو تاریخ کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ تاریخ میں پہلے مصر نمایاں ہوا۔ اس کے بعد یونان اور روم کو شان وشوکت نصیب ہوئی لیکن وہ سب کے سب عیش وعشرت میں مبتلا ہو گئے اور فنون لطیفہ کی ترقی کے باعث ڈوب گئے۔ یہ عمل آج بھی جاری ہے اور اس کی بہترین مثال چین ہے۔ (یہ روسو کے زمانہ کا چین ہے) اس کے برعکس روسو ان شجاع اور غیور اقوام کا ذکر کرتا ہے جو علوم وفنون کی چمک سے محفوظ رہیں۔ اس لیے وہ بہادری، پاکیزگی اور مسرت سے بہرہ ور ہیں۔ اس نے سیتھنا کی مثال دی ہے اور اپنے موقف کی وضاحت کے لئے ایتھنز اور سپارٹا کے فرق کی طرف توجہ دلائی ہے۔

وہ یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ علوم وفنون کا منبع گناہ اور بدی میں ہے مثلاً فلکیات کی ابتدا توہمات سے ہوئی۔ وضاحت و بلاغت کی ابتدا چاپلوسی، چالبازی، نفرت اور خواہشات سے ہوئی۔ ریاضی نے لالچ سے اور طبیعیات نے فضول حیرت سے جنم لیا۔ جبکہ اخلاقیات کا منبع غرور ہے۔ مختصر یہ کہ علم کی ابتدا برائی سے ہوئی ہے۔ علوم کا مقصد بھی گھٹیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر علم سیاسی، اخلاقی اور سماجی گراوٹ کا باعث بنا ہے۔ فنون اور عیش پرستی ایک ساتھ چلتے ہیں۔ عیش پرستی کا باعث بننے کی وجہ سے علوم وفنون کو مکروہ اور مذموم مشاغل سمجھنا چاہئے۔ عیش پرستی پر اس کا ایک خاص اعتراض یہ ہے کہ اس سے دولت کی ہوس بڑھتی ہے

اور سماجی وقار کی عمارت اخلاقی بنیادوں کے بجائے معاشی بنیادوں پر کھڑی کی جاتی ہے۔

روسو کے زمانے میں بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ عیاش امراء بہت سے لوگوں کے لئے روزگار کا وسیلہ بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر عیاش امراء کو گانے والوں، ناچنے والوں، شاعروں، باورچیوں، خانساموں، حکیموں اور ڈرائیوروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ان لوگوں کو ملازم رکھتے ہیں اور یہی نہیں کہ بلکہ ان لوگوں کی وجہ سے کئی اوروں کو روزگار مل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی امیر کے دربار میں صرف ایک ناچنے والی ہو تو اس کے ساتھ کئی سازندے اور ملازم ہوں گے اور بنانے سنوارنے والے بھی ہوں گے۔ روسو اس دلیل کو مسترد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عیاشی سے انسان کی عظمت اور وقار کا پتا نہیں چلتا بلکہ یہ چیز تو جانوروں کے لائق ہے نہ کہ باوقار انسانوں کے۔

روسو نے یہ سب خیالات اٹھارہویں صدی کے وسط میں قلمبند کئے تھے۔ وہ سائنس اور علوم پر یقین کے دن تھے۔ ترقی اور پیش رفت کے نئے نئے راستے کھل رہے تھے۔ زندگی بدل رہی تھی اور زندگی کا مجموعی معیار، کم از کم یورپ کی حد تک، بہتر ہونے لگا تھا۔ لوگ علوم وفنون کے احیاء سے بہت سی امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھے۔ اس ماحول میں جب روسو نے یہ منادی کہ سائنس اور علوم وفنون انسان کو زوال اور گمراہی کے غار کی طرف لئے جا رہے ہیں تو بہت سے لوگ چونک اٹھے۔ وہ روسو کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ یہ کون شخص ہے اور اپنے انوکھے دعویٰ کے لئے اس کے پاس کون سے دلائل ہیں۔ خیر، یہاں ہم کو یاد رکھنا چاہئے کہ یہ روسو ہی نہ تھا جس نے پہلی بار علوم وفنون اور تہذیب و شائستگی کی مذمت کی ہو اور ان کو خرابیوں کا سبب ٹھہرایا ہو۔ اس قسم کا طرز احساس رکھنے والے لوگ ہمیشہ اور کم و بیش ہر جگہ میں موجود رہے ہیں۔ اس کے باوجود ہم کو یہ ماننے میں تامل نہ ہونا چاہئے کہ روسو نے اپنا نقطہ نظر بڑے زوردار انداز میں پیش کیا تھا اور وہ لوگوں کو متاثر کرتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر محمود حسین کا کہنا یہ ہے کہ اگرچہ روسو اس مقالے میں اپنے دعوؤں کے حق میں کافی دلائل فراہم نہ کر سکا تھا، علاوہ ازیں عبارت آرائی اور لفاظی نے بھی مقالے کی علمی حیثیت کو نقصان پہنچایا تھا، مگر باوجود ان باتوں کے اس کے شائع ہوتے ہی فرانس کی علمی دنیا میں ایک ہلچل مچ گئی اور کیوں نہ مچتی! عبارت کا ہر لفظ دہکتا ہوا انگارہ ہے۔ مصنف دیکھتے ہی دیکھتے غیر معمولی شہرت کا مالک بن گیا۔ اس کے ایک معاصر

نے ہم کو یقین دلایا کہ اس مقالہ کی اشاعت نے ''ایک عالمگیر خوف سا پیدا کر دیا۔''

بہر حال روسو نے مقالہ لکھا اور ویژون کی اکادمی کو پیش کر دیا۔ اکادمی کے انعامی مقابلے میں چودہ افراد نے حصہ لیا لیکن انعام روسو کے حصے میں آیا۔ اکادمی نے انعام کا اعلان 8 جولائی 1750ء کو کیا۔ اسی سال کے آخر میں روسو نے یہ مقالہ شائع کروا دیا۔

یہ مقالہ روسو کی پہلی باقاعدہ تحریر تھی جس میں اس نے اپنے خیالات پیش کئے تھے۔ پہلی تحریر سے پہلی محبوبہ جیسی محبت ہوا کرتی ہے۔ پھر بھی روسو کو داد دینی چاہئے کہ اس نے خود اس مقالے کی بعض کمزوریوں کا اعتراف کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اگرچہ یہ مقالہ قوت اور جوش و خروش سے بھرپور ہے لیکن منطق کے اعتبار سے کمزور ہے۔ اس نے پہلے مقالہ کو اپنی دوسری تمام تحریروں کے مقالے میں استدلال اور ہم آہنگی کے لحاظ سے کمزور ترین قرار دیا ہے۔ اس کی ایک وجہ، جائز طور پر وہ یہ بتاتا ہے کہ '' لکھنے کا فن ایک بار ہی تو نہیں آ جاتا۔'' ''اعترافات'' میں وہ ہم کو بتاتا ہے کہ ''مجھے جو اعزاز ملا، مجھ کو اس کی توقع نہ تھی۔ لہٰذا انعام حاصل کرنے کی غرض سے مقالہ اکادمی کے سپرد کرنے کے بعد بھی میں نے اس موضوع پر کام جاری رکھا اور اس میں اضافے کئے یہاں تک کہ وہ اپنی اصل صورت سے بالکل مختلف تحریر بن گیا، تاہم میں نے مقالے کو اسی صورت میں شائع کروایا جس میں اس کو انعام کا حق دار قرار دیا گیا تھا۔''

ہمارے پاس یہ یقین کرنے کا جواز موجود ہے کہ روسو اس مقالے سے مطمئن نہ تھا۔ چنانچہ انعام حاصل کرنے کے تیرہ برس بعد جب 1763ء میں اس کی تحریروں کا مجموعہ شائع ہوا تو روسو نے اس مقالہ کے ساتھ اس عبارت کا اضافہ کر دیا ''ناموری کیا شے ہے؟ یہاں وہ بدقسمت مقالہ پیش کیا جا رہا ہے جو میری ناموری اور شہرت کا باعث بنا تھا۔ بلاشبہ وہ مقالہ جس نے انعام جیتا اور جس نے مجھے نامور اور مشہور بنا دیا، وہ اگر کچھ تو ہے تو بس اوسط درجے کا مقالہ ہے اور میں یہ کہنے کی جرأت بھی کروں گا کہ وہ اس مجموعہ کا کمزور ترین مقالہ ہے۔''

دیدرو کی جیل کی طرف جانے والی سڑک پر روسو کو جو نفسیاتی واردات پیش آئی تھی اس نے روسو کے طرز فکر اور زندگی دونوں کو بدل ڈالا۔ وہ غور و فکر اور تصنیف و تالیف کے کام کی طرف مائل ہوا۔ محض انفرادی تبدیلی نہیں آئی بلکہ اس ''کشف'' سے پیدا ہونے

والے خیالات نے عارضی طور پر ہی سہی، یورپ کو ایک نیا ''مقدس عقیدہ'' عطا کر دیا۔ اس عقیدے نے براعظم کے بہت سے ذہنوں کو متاثر کیا۔ روسو کو بنیادی نکتہ مل گیا تھا اور وہ بعد کی تحریروں میں مسلسل اس کو دہراتا رہا۔ وہ ہم کو بتاتا ہے کہ اس واردات نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے خیالات میں پائے جانے والے انتشار کو دور کر کے نظم و ضبط پیدا کر دیا اور اس پر ایک نئی دنیا آشکار کر دی۔ اس قسم کے خیالات اس کے ذہن میں پہلے نہ تھے۔ روس کے پاس اب ایک نیا تصور تھا اور وہ اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا جب کوئی نیا خیال اس قدر جذباتی شدت کے ساتھ انسان کو قابو میں کر لے تو پھر اس انسان کے لئے زندگی آسان نہیں رہتی۔ یہی حال روسو کا ہوا۔ اس کی کایا کلپ ہوگئی۔ وہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ ''اس ایک لمحے نے مجھے برباد کر ڈالا۔''

آیئے یہ باب ختم کرنے سے پہلے ہم اس سارے معاملے کو ذرا مختلف حوالے سے بھی دیکھیں۔ روسو کی تحریروں کا مرکزی خیال یہ ہے کہ تہذیب نے انسانوں کو اخلاقی اور روحانی اعتبار سے بدحال کر دیا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو اس کو ''کشف'' سے حاصل ہوا تھا۔ روحانیت میں ایمان رکھنے والے لوگ اس کشف کا کوئی ماورائی منبع تلاش کر لیتے ہیں۔ جن کا نقطہ نظر مختلف ہے وہ اس کی توجیہہ نفسیاتی حوالوں میں پا لیتے ہیں، تاہم روسو اور اس کی تحریروں میں دلچسپی رکھنے والے اکثر لوگوں کا کہنا یہی ہے کہ اس نے اپنے فکر کا مرکزی نکتہ اس واردات سے حاصل کیا تھا۔

چند نقادوں کا دعویٰ البتہ مختلف ہے۔ وہ اس نکتہ کو دیدرو سے منسوب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کشف کا سارا قصہ محض روسو کی گپ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب ویژون کی اکادمی نے انعامی تحریری مقابلہ کے لئے یہ موضوع چنا کہ ''آیا علوم وفنون کی ترقی نے اخلاق سدھارنے میں مدد دی ہے یا ان کو بگاڑ دیا ہے'' تو روسو اس سوال کا جواب یہ دینا چاہتا تھا کہ اس ترقی سے اخلاق وتہذیب کو تقویت ملی ہے لیکن دیدرو نے اس کو روک دیا۔ اس نے کہا کہ اس جواب کی بنیاد پر محض روایتی قسم کا مقالہ لکھا جا سکے گا۔ وہ لوگوں کی توجہ جذب نہ کر سکے گا لہٰذا اس نے روسو کو منفی نقطہ نظر اختیار کرنے کی ترغیب دی جس میں جدت ہو سکتی تھی۔ وہ لوگوں کو چونکا سکتا تھا اور جس کے انعام حاصل کرنے کے زیادہ امکانات ہو سکتے تھے۔ روسو نے اپنے دوست کا مشورہ پلے باندھا اور اس کے مطابق مقالہ لکھ ڈالا۔

مقالہ کو نہ صرف انعام ملا بلکہ اس کی دھوم بھی بہت مچی۔ گمنام روسو نامور بن گیا۔ یوں روسو خود اس تصور کے قابو میں آ گیا جس نے اس کو انعام اورش ہرت دلوائی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ یہ ''بھید'' خود دیدرو کے دوستوں نے افشا کیا تھا۔ جیسا کہ آئندہ چل کر ہم دیکھیں گے کہ آنے والے برسوں میں دیدرو کے ساتھ روسو کے تعلقات بگڑ گئے تھے۔ اس لیے آپ اس دعویٰ کو دیدرو کے دوستوں کی طرف سے روسو کی اہمیت کو گھٹانے کا بہانہ جانیں یا سمجھیں کہ وہ الزام آرائی پر اتر آئے تھے، تاہم دونوں صورتوں میں یہ دعویٰ بہت اہم ہے۔ اگر وہ سچا ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ روسو کا سارا فکری نظام ایک متناقصہ سے اخذ شدہ ہے جو اول اول محض انعام اورشہرت حاصل کرنے کی خاطر قبول کیا گیا تھا اور پھر منافقت کے باعث روسو اس سے زندگی بھر چمٹا رہا۔

سکالرز کی اکثریت نے علوم وفنون اور تہذیب پر روسو کی کڑی تنقید کے منبع کی اس توجیہہ کو رد کیا ہے جو ان لوگوں کو پھیلائی ہوئی ہے جن سے روسو کا جھگڑا ہوا تھا اور جو اس کی خودنوشت کی اشاعت سے خائف تھے۔ ان کو اندیشہ تھا کہ روسو کو بے باک ''اعترافات'' کی اشاعت سے ان کے کئی بھید لوگوں تک پہنچ جائیں گے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ خود دیدرو نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ ویژون کی اکادمی کے انعامی مقابلہ کے لئے لکھے جانے والے مقالہ کا مرکزی خیال اس نے روسو کو دیا تھا۔ لہٰذا ہم اس توجیہہ کو مسترد کر سکتے ہیں۔

آیئے آخر میں ہم روسو کی وضاحت بھی جان لیں۔ ''اعترافات'' میں اس نے لکھا ہے کہ ''اپنے خیالات کو تحریری صورت میں پیش کرنے سے پہلے میں نے اپنے موضوع پر لمبے عرصے تک گہرا غور وفکر کیا تھا اور ہر پہلو سے اس کا جائزہ لیا تھا............ مجھے شبہ ہے کہ میرے مخالفین میں سے کوئی اس حد تک جا سکتا ہے............ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے بھی کوئی معقول اعتراض نہیں کیا۔''

دوسرا مقالہ

دیژون کی اکادمی کے انعامی مقابلہ کے لئے لکھے جانے والے مقالے میں روسو نے جو نقطۂ نظر اختیار کیا وہ ایک مکمل طرز حیات کی نمائندگی بھی کرتا تھا۔ یعنی اگر علوم وفنون اور تہذیب وتمدن اخلاقی زوال کا باعث بنتے ہیں تو پھر صاف طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس زوال سے بچنے کے لئے فطرت کی آغوش میں پناہ لینی چاہئے۔

روسو کے ذہن میں اب یہی خیال سمایا ہوا تھا۔ وہ مشہور ہو چکا تھا اور اس پر اعتراض بھی بہت سے ہو رہے تھے۔ کئی دانشوروں اور فلسفیوں نے اس کے دعویٰ کی تردید میں مضامین اور پمفلٹ لکھے۔ نکتہ چین دانشوروں کا عمومی استدلال یہ تھا کہ روسو نے اپنے دعویٰ کو درست ثابت کرنے کے لئے دلائل سے کام کم لیا ہے۔ اس کے بجائے وہ جوش و خروش پیدا کر کے اپنی بات منوانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اعتراض کسی حد تک درست تھا۔ اصل میں ایک تو مقالہ بہت مختصر تھا اور اس پر ضروری تفصیلات کے ساتھ اپنی بات کہنے کی گنجائش محدود تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ تربیت یافتہ فلسفی ہونا تو دور کی بات ہے، روسو ابتدائی رسمی تعلیم سے بھی محروم تھا لہٰذا اس کے دلائل، طرز استدلال اور اسلوب تحریر میں فنی پختگی موجود نہ تھی۔ اس کے مقالے میں تضادات ڈھونڈنا آسان تھا اور اس کے دلائل کو غیر متعلقہ ثابت کرنے میں بھی زیادہ دشواری پیش نہ آئی تھی۔

جہاں تک ممکن ہوا، روسو نے مخالفین کے اعتراضات کے جواب دیئے۔ یوں اس کو دوسروں کی بات سننے اور ان کے دلائل کو رد کر کے اپنا موقف پیش کرنے کا ڈھنگ سیکھنے کا موقع مل گیا۔ آئندہ زندگی میں بھی اس نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ پھر اس کو خیال آیا کہ اپنے نظریے کی مطابقت میں زندگی بسر کرنی چاہئے اور خود کو اس طرز حیات کے نمونہ کے طور

پر پیش کرنا چاہیے جس کی وہ وکالت کر رہا تھا۔ روسو نے اس کو فطرت کی مطابقت کے ساتھ ساتھ آزادی اور غربت کی زندگی کا نام بھی دیا ہے۔ اس نے ملازمت چھوڑ دی۔ سماجی احترام سے دست بردار ہو گیا اور نئے زمانہ کی نشاندہی کرنے والی جو دو چار چیزیں اس کے پاس تھیں، ان سے نجات پا لی۔ اس سلسلے میں اس کی گھڑی کی مثال عام طور پر دی جاتی ہے۔ اس نے سوچا کہ جب فطرت انسان کو دن اور رات کا فرق بتا دیتی ہے تو پھر گھڑی رکھنے کی کیا ضرورت ہے، اس نے گھڑی فروخت کر دی۔ گزر بسر کے لئے موسیقی کی نقلیں تیار کرنے لگا۔ یہ ایک سادہ کام تھا اور اس کو فطرت کے تقاضوں سے ہم آہنگ قرار دیا جا سکتا تھا۔

وہ ایک نئے رنگ ڈھنگ سے رہنے لگا۔ عام لوگوں کو اس سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ جو اس کا مقالہ نہیں پڑھ سکتے تھے اور اس کا موقف سمجھنے سے قاصر تھے، وہ اس کو دیکھ کر اس کے فلسفے کے انداز سے گانے لگے۔ جب زیادہ دھوم ہوئی تو نکتہ چین کہنے لگے کہ یہ سب ڈھونگ ہے جو اس نے شہرت کی خاطر رچایا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ نکتہ چین بالکل غلط نہ کہتے ہوں مگر آیئے ہم شبہات سے دور رہیں اور سمجھیں کہ روسو نے شہرت کے لئے کوئی ڈھونگ نہیں رچایا تھا۔ اس کے بجائے وہ اپنے فکر اور عمل میں دوری کو مٹانا چاہتا تھا۔

کچھ بھی ہو، یہ بات یقینی ہے کہ اس طرز زندگی سے وہ نکتہ چینوں کے منہ بند نہ کر سکا۔ ایک بار پھر اس کو دلائل کا جواب دلائل سے دینا پڑا۔ ہمارے پاس گنجائش ہوتی تو ہم ان ذہنی جھگڑوں کی تفصیل درج کرتے۔ تب ہم کو معلوم ہوتا کہ یہ جھگڑے بعض اوقات کس قدر گہرے اور بصیرت افروز اور کبھی کبھی کس قدر سطحی اور مضحکہ خیز ہو جایا کرتے تھے لیکن ہم کو اپنی حدود میں رہتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔ لہٰذا ان جھگڑوں کو یہیں چھوڑتے ہیں۔

آگے بڑھتے ہوئے ہم کو روسو کے ایک ڈرامہ کے دیباچہ پر ایک پل کے لئے رکنا ہوگا۔ یہ دیباچہ اس نے 1752ء میں لکھا تھا۔ گویا یہ پہلے مقالہ کے بعد کی تحریر ہے۔ اس میں وہ کہتا ہے کہ علم (اور علم سے اس زمانے کے عمومی رواج کے مطابق اس کی مراد فلسفیانہ غور وفکر تھا) ہر ایرے غیر کے لیے نہیں ہے بلکہ ان ذہین وفطین افراد کے لئے ہے جو سب کی بھلائی کے لئے برسر پیکار رہتے ہیں۔ گویا علم اور غور وفکر خاص لوگوں سے مخصوص ہے اور اس کا عام لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ صاف طور پر نہیں جتلاتا کہ وہ خود بھی خواص کے اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے، تاہم اس کے لہجے اور بحث کے انداز سے یہ قیاس

کرنا مشکل نہیں کہ اس کا یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا کہ وہ ان خاص افراد کی صف میں شامل ہے۔ شہرت اور دوسروں کی توجہ ملنے سے وہ خود کو غیر معمولی شخصیت سمجھنے لگا تھا، جس کا کوئی مشن ہو اور اس مشن کو مکمل کرنا ہو۔ وہ صاحب الہام ہونے کا مدعی بھی تھا۔ اس دیباچے میں وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ تضادات سماج میں بدی کی مخصوص عورتیں ہیں۔

انہی دنوں ایک اور کامیابی روسو کے مقدر میں لکھی تھی۔ اس نے ''ڈاروین دی ولائج'' کے عنوان سے ایک چھوٹا اوپیرا تقریباً چھ ہفتے کی مدت میں کمپوز کیا۔ یہ اوپیرا فرانس کے بادشاہ اور دوسرے لوگوں نے بہت پسند کیا اور خوب داد دی۔ لوئی نے دوسرے روز روسو کو دربار میں طلب کر لیا۔ سب لوگوں کو یقین تھا کہ روسو کو بلا کر بادشاہ پسندیدگی کا اظہار کرے گا اور اس کے لئے وظیفہ مقرر کر دے گا۔ روسو کو مگر خود پر اعتماد نہ تھا لہٰذا دربار میں طلبی پر وہ بدحواس ہو گیا اور صبح سویرے گھر سے بھاگ گیا۔ پھر بھی دربار کی طرف سے اس کے لئے انعام کا اعلان کر دیا گیا۔ اس انعام کی تقریباً اتنی تھی جتنی اس کو بعد ازاں بیس سالہ محنت کے بعد اپنی کتاب ''ایمیل'' کی اشاعت سے حاصل ہوئی۔

ان ایام کی روسو کی تحریروں اور خطوط میں پیش کئے جانے والے خیالات اور اس کے طنزیہ لہجے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''رائج الوقت نظام پر ایک حملہ کرنے کی خاطر وہ کسی مناسب موقع کی تاک میں تھا۔''

جلد ہی یعنی 1753ء میں یہ موقع اس کے ہاتھ آ گیا۔ ویژون کی اکادمی نے مقالہ نگاری کے ایک اور انعامی مقابلے کا اعلان کیا۔ اس بار اکادمی نے مقالہ نگاری کے لئے ''انسانی اونچ نیچ کا منبع اور اس کے اسباب'' کا موضوع چنا۔ اس صورتحال میں یہ موضوع روسو کے لئے اس قدر موزوں تھا کہ وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ان مقابلوں کے پردے میں قدرت اس کو اپنے خیالات کے اظہار کا موقع مہیا کر رہی ہے۔ اس نے مقابلے میں حصہ لینے کا ارادہ کیا اور اس موضوع پر ایک مقالہ لکھا۔ وہ اس مقالے کو حقیقی معنوں میں اپنی پہلی تحریر قرار دیتا ہے، جس میں اس کے فلسفیانہ اصولوں کو ترقی دی گئی ہے۔ ''اعترافات'' میں اس نے بتایا ہے کہ ''اس عظیم موضوع پر غور وفکر کے لئے میں نے سات آٹھ دنوں تک سینٹ جرمین تک کا سفر کیا۔ عین جنگل کے درمیان میں نے قدیم زمانوں کو تلاش کیا۔ میں نے انسانوں کے روپ دیکھے۔ ان کی فطرت کو اجاگر کیا۔ میں نے وقت اور ارتقا کا پیچھا کیا

جنہوں نے اس فطرت کو مسخ کر دیا ہے............ اس گیان دھیان کے نتائج سے یہ مقالہ مرتب ہوا۔ یہ وہ تجربہ ہے جس کو پورے یورپ میں چند ہی ایسے قاری ملے جو اس کو سمجھ سکے لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے بارے میں زبان کھولنے پر آمادہ نہ تھا۔“

خیر، اس مرتبہ روسو کے خیالات کی تیز و تندی اکادمی کے جج صاحبان کے احساسات کے لئے قابل قبول حد سے زیادہ ثابت ہوئی اور وہ اس کو انعام سے نہ نوازا جا سکے۔ تاہم روسو ہم کو جتلاتا ہے کہ اس ناکامی کا اس کو پہلے ہی سے پتا تھا۔ اس کے بقول وجہ یہ تھی کہ ویژون کی اکادمی صوبائی درجے کی ایک اکادمی تھی۔ اس کی اقدار کے حوالے سے یہ مقالہ ضرورت سے زیادہ جرأت مندانہ تھا۔ اصل میں بات شاید یہ تھی اپنے پہلے مقالہ کی وجہ سے شہرت حاصل کرنے کے بعد اب وہ اپنے معاصرین کے تعصّبات کا خیال رکھنے سے زیادہ سچائی تلاش کرنے پر توجہ دینے لگا تھا۔ اس مقالہ کو انقلابی تحریر کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کیونکہ روسو نے اس میں اپنا موقف اس جوش و ولولے سے پیش کیا ہے جو صرف انقلابیوں سے ہی مخصوص ہوا کرتا ہے، تاہم اس نے جو نتائج اخذ کئے وہ انقلاب آفرین ہوتے ہوئے بھی معقولیت کی حدود سے کم ہی باہر جاتے ہیں۔

اس مقالے میں روسو کے پیش نظر مندرجہ ذیل پانچ مقاصد تھے:

1۔ انسانیت کی حمایت اور اس کو اخلاقی الزامات سے بری الذمہ قرار دینا۔
2۔ وہ اس اونچ نیچ کی وضاحت کرنا چاہتا تھا جو نوع انسانی نے قبول کر رکھی ہے۔
3۔ اس عدم مساوات کے اسباب کو سمجھنا اور یہ بھی دیکھنا کہ انسانوں نے اس کو کیوں قبول کر رکھا ہے۔
4۔ ان وضاحتوں کے ساتھ ساتھ روسو اپنے تصور کو بھی ثابت کرنے کا آرزومند تھا کہ اگرچہ علوم وفنون اور تہذیب و تمدن کی ترقی نے انسانی فطرت کو مسخ کر ڈالا ہے، مگر وہ تباہ نہیں ہوئی گویا اس کا احیا ممکن ہے۔
5۔ لوگوں میں تبدیلی کی خواہش پیدا کرنا تا کہ وہ فطرت کی طرف لوٹیں اور گم گشتہ ماضی کو از سر نو زندہ کریں۔

ڈاکٹر سی اے قادر اس مقالے پر بحث کرتے ہوئے انگریز سکالر جیک ہوڈ بروم کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ روسو کے نزدیک اگر انسان سے وہ خصوصیات منہا کر لی جائیں

جو اس نے ارتقا کے عمل کے دوران سیکھی ہیں تو وہ محض فطری انسان کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ اس صورت میں ایک ایسے حیوان کے طور پر نمایاں ہوتا ہے جس کا گزارہ صرف حواس پر ہے اور جو اپنی ضرورتیں گردوپیش کے ماحول سے پوری کرتا ہے۔ وہ نہ تو بزدل ہوتا ہے اور نہ ہی اس میں جارحیت پائی جاتی ہے۔ اس کا واحد مقصد اپنی بقا ہے۔ اصل میں وہ ماحول پر انحصار کر کے ہی زندگی بسر کرتا ہے۔

روسو کے نزدیک انسانوں اور حیوانوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والی خصوصیت انسان کا آزاد ارادہ ہے۔ آزادی کا تصور روسو کے لئے ضروری ہے کیونکہ اس کا نظام حرکی ہے۔ وہ جدوجہد کا درس دیتا ہے۔ دوسری امتیازی خصوصیت انسان میں روح کی موجودگی ہے۔ اس کا پتاہ بھی آزاد ارادہ سے ملتا ہے۔ انسان کا تیسرا خاصہ کمال پذیری ہے جس کی وجہ سے انسان غلطیاں اور حماقتیں کرتا ہے۔

قدیم انسان کے کردار کو ہم اخلاقی اصطلاحوں میں بیان نہیں کر سکتے، لہٰذا ہم کو یوں کہنا چاہئے کہ اس کا کردار اچھا تھا اور نہ ہی برا۔ لیکن اس میں دو ایسے رجحانات موجود تھے جو سماجی زندگی کی طرف لے جا سکتے تھے۔ ان میں سے ایک جنسی رجحان تھا اور دوسرے کا تعلق خطرے کا مقابلہ کرنے سے تھا۔ انسانی تاریخ میں پہلا انقلاب اس وقت آیا جب انسان نے خاندانی زندگی اختیار کی۔ اس نے اپنے لئے مکان بنائے اور نجی جائیداد کا تصور اس کے ذہن میں پیدا ہوا۔ روسو اس زمانے کو سنہری دور قرار دینے پر آمادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پرسکون زمانہ تھا۔ اس میں بہت کم تبدیلیاں رونما ہوئیں اور وہ توازن کا زمانہ بھی تھا۔ اس زمانے میں انسان حیوانوں سے ممتاز ہو چکا تھا مگر تہذیب کی آلودگیوں سے محفوظ بھی تھا۔

انسانی ارتقا میں دوسرا انقلاب اس وقت آیا جب انسان نے کھیتی باڑی شروع کی اور دھاتوں کا استعمال شروع ہوا۔ کھیتی باڑی کے نتیجے میں اس کو اپنی فوری اور سادہ ضروریات سے زیادہ اناج حاصل ہونے لگا تو نجی ملکیت کا تصور پختہ ہو گیا۔ تقسیم کار پیدا ہوئی۔ مہارتوں میں اضافہ ہوا اور مقابلے کا جذبہ بھی فروغ پانے لگا۔ اس سے خودغرضی میں اضافہ ہوا۔ اس دور میں خودمختاری اور خودکفالتی ختم ہوئی۔ دست نگری اور غلامی نے اس کی جگہ لے لی۔ خودغرضی اور کشمکش کو قابو میں رکھنے کی خاطر ریاست کی ضرورت محسوس ہونے

لگی۔ یوں تیسرے انقلاب کی راہ ہموار ہوئی جس میں ابتدائی قسم کی اتھارٹی نے جنم لیا۔ لوگ گروہوں میں تقسیم ہونے لگے۔ جو طاقتور تھے، انہوں نے اپنی بالادستی کو منوانا شروع کر دیا اور زیر دستوں کو قابو میں رکھنے کی مختلف تدابیر پر عمل شروع ہو گیا۔ یوں ایک نظام جنم لینے لگا۔ لوگوں نے اپنی آزادی کے تحفظ کے خیال سے اس نظام کو قبول کر لیا۔ روسو کے نزدیک یہ ایک قسم کا معاہدہ ہے لیکن یہ معاہدہ نیک نیتی پر مبنی نہیں۔ اس کی بنیاد ظلم اور بالادستی پر ہے۔

سماجی معاہدہ سے کیا مراد ہے اور یہ کس قسم کا ہونا چاہئے؟ روسو نے اس سوال کا جواب چند سال بعد اپنی شہرہ آفاق کتاب ''معاہدہ عمرانی'' کی صورت میں دیا۔

محبوب شہر اور والتیئر

روسو اب پیرس میں رہتا تھا۔ وہ گمنام آوارہ گرد نہ رہا بلکہ مشہور اور معزز بن رہا تھا۔ لیکن پیرس اس کے لئے بیگانہ شہر ہی رہا۔ اس کی یادوں اور خوابوں میں جنیوا آباد تھا، جہاں اس نے جنم لیا تھا۔ دل اب بھی اس محبوب شہر کے لئے مچلتا تھا۔ نا مہربان ماحول میں رہتے ہوئے وہ اکتایا تو 1754ء کے موسم گرما میں تریزے کو ساتھ لے کر جنیوا کی طرف چل پڑا۔ راہ میں مادام دے وارین کی یاد آئی تو سوائے میں رک گیا، مگر مادام کے ساتھ یہ ملاقات اس کے لئے گہرے صدمے کا باعث بنی۔ اصل میں یہ ویسا ہی صدمہ تھا جس سے ہم اس وقت دو چار ہوا کرتے ہیں جب مدتوں کے بعد اپنے کسی پیارے سے ملنے جاتے ہیں اور ملنے کی تڑپ میں بھول جاتے ہیں کہ وقت ہم انسانوں کے ساتھ بے رحمی سے پیش آتا ہے۔ وقت گزرنے کے بعد ہمارے پیارے بھی ویسے نہیں رہتے جیسے ہم ان کو جدائی کے لمحے میں چھوڑ آئے تھے۔

روسو مادام سے ملا اور یہ کیا ملاقات تھی۔ اسی سے سنئے ''میں نے اس کو دیکھا...... لیکن کس حال میں! اوہ میرے خدا! اس کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ آہ، کیا یہ اچھے دنوں کے وہی مادام دے وارین تھی جس کے پاس مجھے پادری نے بھیجا تھا! اس کو دیکھ کر میرا دل کیسا بھر آیا۔''

مادام چون برس کی ہو چکی تھی۔ بڑھاپا اس پر نازل ہو رہا تھا اور مفلسی نے اس کا رنگ روپ اور بھی مسخ کر دیا تھا۔ روسو ہم کو یقین دلاتا ہے کہ اس نے مادام کو سوائے سے نکلنے اور اسکے ساتھ رہنے پر آمادہ کرنے کی بہت کوشش کی۔ اس نے کہا کہ وہ اور ٹریزے اس کو خوش رکھنے کے لئے سب کچھ کریں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پرانے دنوں کی اس

مہربان خاتون کو بھولا نہ تھا۔ یہ بھی ہے کہ اس نے مادام کے اچھے دن دیکھے تھے۔ کبھی کبھی وہ اس کو تھوڑی بہت رقم بھیجتا رہا تھا۔ وہ نادار اور تنگ دست ہو چکی تھی۔ عرصے سے اس کو سارڈینیا کے بادشاہ کی طرف سے ملنے والی پنشن بھی بند ہو چکی تھی۔ پھر بھی وہ روسو کے پاس پناہ لینے پر تیار نہ ہوئی۔

جب روسو جنیوا پہنچا تو مادام ایک بار اس سے ملنے آئی، مگر تنگ دستی کا عالم یہ تھا کہ اس کے پاس واپسی کے لئے رقم بھی نہ تھی۔ روسو لکھتا ہے کہ ''اس روز میرے پاس بھی کچھ نہ تھا۔ مادام کے جانے کے بعد میں نے تریزے کے ذریعے اس کو روپے بھیجے۔ آہ بے چاری ماں! آخر میں تمہیں اس کے دل کا قصہ سناؤں۔ تریزے اس سے ملی تو مادام کے پاس بس سونے کا ایک چھوٹا سا چھلا رہ گیا تھا۔ اس نے وہ انگلی سے اتارا اور تریزے کو پہنانا چاہا۔ جب تریزے اس کے ہاتھ چومنے لگی تو چھلا واپس اس کی انگلی میں ڈال دیا اور اس کو اپنے آنسوؤں سے تر کر ڈالا۔''

روسو کی بے نیازیوں اور لاپرواہیوں کو مدنظر رکھا جائے تو مادام کے لیے اس کی یہ ہمدردی غیر متوقع محسوس ہوتی ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ''اعترافات'' میں اس نے خود کو اس بات کے لئے بہت کوسا ہے کہ اس نے مادام کا ویسے خیال نہ رکھا تھا جیسا کہ اس کو رکھنا چاہیئے تھا، وہ اگلے جہان میں اس کوتاہی کا مداوا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

جنیوا میں روسو کو ایک اور پریشانی کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اس شہر سے اس کو بے پناہ محبت تھی۔ لیکن پروٹسٹنٹ مذہب کو تیاگ کر کیتھولک عقیدہ قبول کرنے کے باعث وہ جنیوا کے شہری حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ جلد ہی اس نے یہ حقوق دوبارہ حاصل کرنے کی راہ میں حائل رکاوٹ دور کرنے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ وہ دوبارہ پروٹسٹنٹ بن گیا۔ جس قدر آسانی کے ساتھ اس نے آبائی مذہب ترک کیا تھا، اسی قدر آسانی سے اس نے نئے مذہب کو خیر باد کہا اور آبائی عقیدے کی طرف لوٹ گیا۔

''اعترافات'' میں اس تبدیلی کی ایک مختلف تاویل پیش کی گئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پیرس کے آزاد خیال عالموں، فاضلوں اور دانشوروں کے ساتھ میل جول کے باوجود اس کا ایمان کمزور نہ ہوا تھا۔ سالہا سال سے اس کو بائبل کا باقاعدہ مطالعہ کرنے کی عادت تھی۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس مطالعے سے اس کو معلوم ہوا کہ جو لوگ مسیح کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے،

انہوں نے مسیح کے کلام کی عجیب وغریب تاویلات گھڑی ہیں۔ فلسفیانہ غوروفکر کے ذریعے اس نے ان تاویلات کو رد کر کے مذہب کی بنیادوں تک رسائی پا لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے پروٹسٹنٹ عقیدے کو بھی مسترد کر دیا، جو ان نئی تاویلوں میں سے ایک ہے۔

یہ وہ دن تھے کہ جب پروٹسٹنٹ عقیدہ کے مرکزی شہر جنیوا کے باسیوں پر بھی اس عقیدے کی گرفت ڈھیلی ہو رہی تھی۔ لوگ بائبل کی فرقہ وارانہ تاویلوں سے نکل کر اس کا بنیادی پیغام سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ یورپ کے بعض دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی خدا پرستی کے مذہب (DEISM) کو فروغ مل رہا تھا۔ اس عقیدے پر ایمان رکھنے والوں کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا کے وجود کا علم حاصل کرنے کے لئے کسی ماورائی الہام یا وحی کی ضرورت نہیں بلکہ فطری عقل کے ذریعے انسان خدا کو جان سکتا ہے۔ اس عقیدے نے اول اول سترہویں صدی کے انگلستان میں اظہار پایا۔ اٹھارہویں صدی میں یہ یورپ کے کئی دوسرے ملکوں میں بھی پھیل گیا۔ ہم اس کو عقلیت پرست تحریک کا عنوان دے سکتے ہیں جو منظّم کلیسا اور اس کے منحرفین کے درمیان طویل کشمکش سے پیدا ہوئی۔ اس کے فروغ میں جدید سائنسی خیالات کو بھی دخل تھا۔ خدا پرستی کے اس مذہب پر ایمان رکھنے والے روشن خیالی کے اصولوں کا روایتی مذہب پر اطلاق کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ کہتے کہ ذات باری تعالیٰ کا اظہار اس کی تخلیق کردہ کائنات میں ہوتا ہے اور یہ کہ خدا قوانین فطرت کے مقابل عمل کرتا ہے۔ وہ ایک ایسا مذہب تشکیل دینا چاہتے تھے جو روایتی الہامی مذاہب کی جگہ لے لے۔ ان لوگوں میں نظریاتی اختلافات موجود تھے مگر وہ سب اس امر پر متفق تھے کہ خدا تمام اشیاء کا خالق ہے اور وہی تمام انسانوں کا فیصلہ کرے گا، تاہم وہ اس دنیا اور زندگی میں خدا کی کارفرمائی سے منکر تھے۔ روسو کے زمانے میں پیرس میں یہ مذہب دانشوروں کے حلقے میں خاصا مقبول تھا۔ والتیئر اس پر ایمان رکھتا تھا اور ہم نے والتیئر پر اپنی کتاب میں اس امر کا حوالہ دیا ہے۔ روسو بھی کسی حد تک اپنے زمانے کے اس نئے مذہبی رجحان سے متاثر ہوا تھا۔

جنیوا میں چند ماہ کے قیام کے بعد روسو اکتوبر 1754ء میں پیرس لوٹ گیا۔ یہ شہر اب بھی اس کے لئے موافق نہ تھا۔ چنانچہ اس نے سب کچھ سمیٹ کر ہمیشہ کے لئے جنیوا واپس جانے کا اردہ کیا جو اس کے نزدیک نیکی اور آزادی کا شہر تھا اور جس کے شہری عقل اور

دانائی کے قدردان تھے۔ یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں والتیئر جنیوا میں مقیم تھا۔ وہ پروشیا کے بادشاہ اور اپنے دوست فریڈرک اعظم کے ہاتھوں توہین آمیز سلوک کے بعد اس کی سلطنت سے نکل آیا تھا۔ جنیوا پہنچ کر والتیئر نے جھیل کے کنارے ایک حویلی خریدی اور مستقل طور پر وہیں رہنے کا ارادہ کر لیا۔ اس کی حویلی شہر کے امرا کا ثقافتی مرکز بن رہی تھی۔ روسو کو اندیشہ تھا کہ جنیوا میں والتیئر کی موجودگی سے اس کی اپنی شخصیت ماند پڑ جائے گی۔ والتیئر دولت مند تھا۔ امرا سے اس کے دوستان تعلقات تھے۔ اس کے چاہنے والے بے شمار تھے۔ وہ عورتوں اور نوجوانوں کا محبوب تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ مجلسی زندگی کا دلدادہ اور ماہر تھا۔ وہ زندہ دل، ہنس مکھ، جملے باز اور تیز وطرار تھا۔ مسکین طبع اور الگ تھلگ رہنے والے مفلوک الحال روسو کا چراغ اس کے آگے نہیں چل سکتا تھا۔ چنانچہ روسو نے اس سے دور رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اس نے الزام لگایا کہ والتیئر جنیوا کے شہریوں کو خراب کر رہا ہے۔ وہ خود پیرس میں رہ گیا۔

روسو اور والتیئر کا باہمی تعلق عجیب سا معاملہ ہے۔ دونوں ہم عصر تھے۔ عمر میں والتیئر سولہ سال بڑا تھا مگر وہ دونوں ایک ہی سال یعنی 1778ء میں اس دنیا سے رخصت ہونے والے تھے۔ دونوں مختصر عرصے کے لئے ایک ہی شہر یعنی جنیوا میں رہے اور پیرس میں بھی ان کو ایک ہی وقت پر رہنے کا اتفاق ہوا۔ دونوں اپنے زمانے کے یورپ میں مشہور ترین فلسفی اور ادیب مانے جاتے تھے۔ ان کے درمیان خط و کتابت بھی رہی۔ مگر دونوں کبھی ایک دوسرے سے نہ ملے۔ ان کے درمیان فاصلے سے چپقلش رہی۔

کیا یہ عجیب بات نہیں؟ جب بھی انقلاب فرانس کا ذکر ہوتا ہے یا اٹھارہویں صدی کے فرانس کے ادب و ثقافت کی بات چلتی ہے تو ہمارے ذہنوں میں ان دونوں یعنی والتیئر اور روسو کا نام ابھرتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ تصور مبالغہ آمیز سہی لیکن دنیا بھر کے عام پڑھے لکھے لوگوں کے ذہن میں یہ بات اتر چکی ہے کہ یہی وہ شعلہ انگیز فلسفی تھے جنھوں نے دنیا کے پہلے بورژوا انقلاب کی آگ بڑھائی۔ حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ ان کے علاوہ بھی بہت سے فلسفی، ادیب، فنکار اور دانشور تھے جنھوں نے انقلاب کی راہ ہموار کرنے میں کردار ادا کیا۔ وہ فراموش کئے جا چکے ہیں۔ ان کا ذکر کہیں ملتا ہے تو بس ان موٹی موٹی اور کرم خوردہ کتابوں میں جو لائبریریوں کی زینت تو بڑھاتی ہیں لیکن ان کو پڑھتا کوئی نہیں۔

انقلاب کے حوالے سے والتیئر اور روسو کی شہرت تاریخ کا پراسرار کھیل ہے جس کی توجیہہ کرنا آسان نہیں۔ شاید ہمارے لئے یہ جاننا کافی ہے کہ اگرچہ والتیئر نے اٹھارہویں صدی کے فرانس میں مذہب کی بالادستی کے خلاف بغاوت کی تھی اور اس کے غلبے کو ختم کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا مگر وہ بنیادی طور پر شاہ پرست تھا۔ انقلاب کا طوفان اس کی زندگی کے دوران اٹھ تو آتا تو ممکن ہے کہ وہ انقلابیوں کے بجائے شاہ پرستوں کی صف میں کھڑا ہوتا۔ روسو کا معاملہ زیادہ مختلف نہیں۔ اس نے لوگوں کے حقوق اور انفرادی آزادی کی وکالت کی مگر اس کی نگارشات میں انقلاب کے لئے براہ راست کوئی پیغام موجود نہیں۔

ان دونوں عظیم شخصیات نے آپس میں جو فاصلے رکھے تو اس کی وجہ محض معاصرانہ رقابت نہیں۔ اصل میں ان کے حالات اور مزاج ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ دونوں ایک ہی طبقے میں یعنی نچلے درمیانے شہری طبقے میں پیدا ہوئے تھے، مگر والتیئر نے اپنی تحریکوں، چالاکیوں اور اثر و رسوخ کے ذریعے بہت سی دولت سمیٹ لی تھی۔ وہ شاہانہ زندگی گزارتا تھا۔ روسو کا رہن سہن غریبانہ تھا۔ والتیئر آگ ہی آگ تھا اور یہ آگ ہر وقت بھڑکتی رہتی تھی۔ روسو کی زندگی کی دھن مدھم تھی۔ والتیئر مذہب کا باغی تھا۔ روسو مذہبی شخص تھا۔ والتیئر نے اپنے گرد یورپ کی خوبصورت اور ذہین عورتیں اکٹھی کر لی تھیں۔ روسو اس عورت کے ساتھ خوش رہا جس کو سال کے مہینوں کے نام بھی نہ آتے تھے۔ والتیئر کا فلسفہ خوش باش اور بےفکرے لوگوں کا ضابطہ حیات ہے جبکہ روسو کا فلسفہ افتادگان خاک کے لئے ہے۔

1755ء میں جب ویژون کی اکادمی تحریری مقابلے کے لئے لکھا جانے والا روسو کا دوسرا مقالہ شائع ہوا تو روسو نے اس کا ایک نسخہ والتیئر کو بھیجا۔ والتیئر نے اپنے شوخ طنزیہ انداز میں اس پر تبصرہ کیا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ''انسانی نسل کے خلاف آپ کی نئی کتاب مجھ کو مل گئی ہے اور میں اس عنایت کے لئے شکر گزار ہوں۔ ہم سب کو بدھو بنانے کے لئے کسی اور نے کبھی آپ جیسی دانائی سے کام نہ لیا ہوگا۔ یہ کتاب پڑھ کر ہاتھ پاؤں کے بل چلنے کو جی چاہتا ہے مگر کیا کروں۔ ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ سے یہ عادت بھول چکا ہوں۔ اب دوبارہ اس کو اپنانے میں ناکامی کا مجھے افسوس ہے............

میں نے سنا ہے کہ آپ کی صحت ٹھیک نہیں۔ ایسا ہے تو صحت کی بحالی کے لئے

ہماری گایوں کا دودھ پینے اور ہماری گھاس چرنے کے لئے چلے آؤ۔''

یہ باہر ایک دوستانہ خط ہے۔ روسو نے اس کا جواب بھی دوستانہ دیا۔ اس نے والتیئر کی برتری کو قبول کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ظاہر داری قائم رکھنا چاہتے تھے اور اختلافات کو ہوا دینے سے گریزاں تھے۔ چنانچہ یہ دیکھئے کہ جب روسو ہم کو بتا رہا تھا کہ وہ جنیوا میں والتیئر کی رسوا کن موجودگی کے باعث اپنے اس محبوب شہر میں جانے سے گریز کرتا ہے تو انہی دنوں وہ خط میں والتیئر کو لکھ رہا تھا کہ اس کو اس عزت و وقار کا بھرپور احساس ہے جو والتیئر نے اس کے شہر کو اپنی موجودگی سے عطا کیا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس کی تشریف آوری اور قیام پر جنیوا کے شہری شکر گزار ہیں اور وہ خود بھی ان کے اس جذبے میں شریک ہے۔

یہ دوستانہ منافقت زیادہ عرصہ قائم نہ رہی۔ کچھ عرصے بعد ان دونوں کے باہمی اختلافات بڑھ گئے۔ ہوا یہ کہ 1755ء کے آخری ہفتوں میں لزبن میں شدید لزلزلہ آیا۔ یہ زلزلہ ایک مذہبی تہوار یعنی آل سینٹس ڈے کو آیا تھا جب کہ شہر کے گرجے عبادت گزاروں سے بھرے ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے قیامت ٹوٹ پڑی۔ زلزلے کے جھٹکوں سے شہر کی اکثر عمارتیں تباہ ہوگئیں۔ ہزاروں مرد، عورتیں اور بچے خدا کی عبادت کرتے ہوئے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس زلزلے میں تیس ہزار سے زیادہ افراد لقمہ اجل بن گئے تھے۔ والتیئر اس قدرتی آفت کی ہولناکی سے بہت متاثر ہوا۔ وہ بار بار خود سے پوچھتا تھا کہ یہ کیسا خدا ہے جو بے نیازی سے مخلوق کو روند ڈالتا ہے۔ اپنے تاثرات کو اس نے ''لزبن کی آفت پر نظم'' کے عنوان سے ایک نظم میں بیان کیا ہے، جس کو اٹھارہویں صدی کے فرانسیسی ادب میں امتیازی مقام حاصل ہے۔ بعد ازاں اس نے اپنا شہرہ آفاق ناول کاندید، بھی اس المیہ سے پیدا ہونے والے جذباتی ردعمل کے زیر اثر لکھا تھا۔ ان دونوں تخلیقات میں والتیئر نے اپنے مخصوص رجائی رویے کو ترک کر کے زندگی کی بے معنویت کو نمایاں کیا ہے۔

والتیئر کی شہرت کو قائم رکھنے میں اس نظم اور ناول نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے مگر روسو کو ان دونوں پر اعتراض تھا۔ ناول کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ والتیئر نے اپنے ناول کا بنیادی تصور اس سے چرایا ہے اور نظم کے متعلق کہتا تھا کہ یہ نظم منافقت کا

شاہکار ہے۔ والٹیئر خود زندگی کی نعمتوں، مسرتوں اور خوبصورتیوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے اور دوسروں کو زندگی کی بے معنویت، بے ہودگی اور مایوسی کا درس دے رہا ہے۔

والٹیئر کی آتش مزاجی کے سبب یہ معاملہ بڑھ سکتا تھا، تاہم اس نے غیر متوقع درگزر سے

کام لیا اور دونوں میں جھگڑا بڑھ نہ سکا۔

رومان اور ناول

روسو جنیوا سے لوٹا تو پیرس میں انسائیکلو پیڈیا کی اشاعت شروع ہو چکی تھی۔ یہ ایک تاریخ ساز منصوبہ تھا۔ اس کا مقصد ''کرہ ارض پر بکھرا ہوا علم جمع کرنے'' کے ساتھ ساتھ یورپ اور خاص طور پر فرانس میں روشن خیالی اور عقل پرستی کو رواج دینا بھی تھا۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ محض علمی منصوبہ نہیں تھا۔ اس کے تہذیبی، سماجی اور سیاسی مقاصد بھی تھے اور اس سے تعلق رکھنے والے صاحبان کو ان مقاصد کی زیادہ فکر رہتی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ یورپ اور فرانس میں بوسیدہ جاگیردار ثقافت نے اپنی گرفت مضبوط کر رکھی ہے، تمام رسوم و رواج اور ادارے اسی ثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں اور وہ لوگوں میں صحیح خیالات پیدا ہونے سے روکتے ہیں۔ کلیسا اور بادشاہت کی بالادستی کا سبب بھی یہی ثقافت ہے۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں میں تنقیدی اندازِ فکر، سائنس اور عقل کی روشنی اور روشن خیالی کو پھیلانے کی غرض سے یہ اشاعتی منصوبہ شروع کیا۔ 1751ء سے 1772ء تک کے دوران اس انسائیکلو پیڈیا کی 28 جلدیں شائع ہوئیں۔ چار سال کے وقفے کے بعد اس کی مزید پانچ جلدیں منظر عام پر آئیں اور 1780ء میں دو جلدوں پر مشتمل اس کا اشاریہ شائع ہوا۔ یوں یہ منصوبہ 35 جلدوں میں مکمل ہوا۔

ڈینس دیدرو اس منصوبہ کا انچارج اور مدیر تھا۔ ژاں آلمبیر اس کا معاون رہا۔ انسائیکلو پیڈیا کے لئے فرانس کے بہت سے علماء فضلاء کا تعاون حاصل کیا گیا۔ اس کے مشہور مقالہ نگاروں میں والتیئر، سیاسی نظریہ ساز، چارلس مونٹسکو، ماہر معاشیات اے آر ٹرگوٹ

وغیرہ شامل تھے۔ اس انسائیکلو پیڈیا کو بہت مقبولیت ملی۔ دراصل اس زمانے کے فرانس میں بوسیدہ جاگیرداری ثقافت اور اس کے سیاسی اور مذہبی اداروں کے خلاف ذہنی ردعمل شروع ہو چکا تھا۔ لوگ اس ثقافت سے نجات چاہتے تھے اورانہوں نے تبدیلی لانے والے طریقوں پر غوروفکر شروع کر دیا تھا۔ انسائیکلو پیڈیا نے ان کو نئی راہیں دکھائیں، ان کی سوچ کو منظم کیا اور ایک نئی تحریک عطا کی۔ یوں وہ رویے بنانے میں مدد ملی جو 1789ء کے فرانسیسی انقلاب کا سبب بنے۔ اس انقلاب کے بعد بھی انیسویں صدی کے یورپ کی ذہنی زندگی پر یہ انسائیکلو پیڈیا اثر انداز ہوتا رہا۔

دیدرو اور آلمبیر دونوں روسو کے دوست تھے۔ انہوں نے روسو کو انسائیکلو پیڈیا کے لئے چند مقالات لکھنے کو کہا۔ اس اشتراک کے حوالے سے کئی مقالہ نگاروں کے ساتھ روسو کے تعلقات شروع ہوئے۔

ان ایام میں پیرس کے بعض اعلیٰ خاندانوں کے ساتھ بھی روسو کے رابطے ہوئے۔ بات یہ ہے کہ اس نے اپنی عادتیں بدل لی تھیں۔ اوٹ پٹانگ طور طریقے چھوڑ کر اب وہ سماجی لحاظ سے قابل احترام انداز سے زندگی بسر کرنے لگا تھا۔ ان خاندانوں میں سے ایک اپنے خاندان نے روسو کو مونٹ مورنسی کی وادی میں واقع اپنی حویلی میں رہنے کی دعوت دی تو وہ بہت خوش ہوا۔ ''شور، دھواں اور کیچڑ کے شہر'' پیرس میں بہت سے سال گزارنے کے بعد اس کو اپنی پسندیدہ دیہی زندگی گزارنے کا موقع مل رہا تھا۔ اس نے دعوت قبول کی اور تریزے کو لے کر مونٹ مورنسی میں اپنے خاندان کی جاگیر میں پہنچ گیا۔ وہاں اس کے لئے خاص طور پر ایک گھر تیار کروایا گیا تھا۔ تاہم وہ اس گھر میں دو سال سے کم عرصہ رہا۔ وہ اپریل 1756ء میں وہاں گیا تھا اور دسمبر 1757ء میں مادام ایسپنے، گرم اور دیدرو کے ساتھ یادگار جھگڑے کے بعد وہاں سے نکل آیا۔

جھگڑے کا سبب مادام ایسپنے کی نوجوان نند سوفی بنی جس سے روسو عشق لڑانے لگا تھا۔ جاگیردار دوشیزہ نے خود ہمارے فلسفی کو آگے بڑھنے کا موقع دیا تھا۔ روسو نے شدید قسم کے جذباتی رومان کے تجربے کو اپنے ناول کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس ناول کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ وہ سوفی میں اپنے اس ناول کی ہیروئن جولی کو دیکھنے لگا۔ گویا ادبی تخلیق حقیقی زندگی کے کرداروں اور واقعات پر اثر انداز نہ ہونے لگی تھی۔

یہ رومان صرف چار ماہ چلا۔ سوفی جیسے آگے بڑھی تھی، ویسے ہی پیچھے ہٹ گئی اور اس نے روسو سے تمام رابطے ختم کر دیئے۔ روسو کو شک ہوا کہ سوفی کو اس کے خلاف بھڑکایا گیا ہے اور یہ کام دیدرو نے کیا ہے۔ چنانچہ وہ مادام کے بعد بھی وہ مونٹ مورنس کی خوبصورت وادی سے نکلنے پر تیار نہ تھا۔ اس نے مادام کا گھر چھوڑا اور مونٹ لونی پارک میں ایک گھر کرایہ پر لے کر رہنے لگا۔ اس علاقے میں اس نے لگ بھگ چھ سال بسر کئے۔ اس قیام کے دوران تریزے کی ماں بھی ان دونوں کے ساتھ رہی۔ روسو کی یہ ساس ہر بھونڈے طریقے سے اس کی جیب سے پیسے نکلوانے کی فکر میں رہتی تھی۔ البتہ وہ گھر کی دیکھ بھال اور انتظام میں مددگار بھی ہوتی تھی جبکہ ان معاملات سے تریزے کی بے نیازی بڑھ گئی تھی۔

مونٹ مونسی میں آنے کے کچھ عرصہ بعد روسو نے آلمبیر کے نام خط کے عنوان سے ایک مکتوب لکھا۔ اس کی بہت سی دوسری تحریروں کی طرح یہ مکتوب بھی حالات کا نتیجہ تھا۔ آلمبیر نے انسائیکلو پیڈیا کی ساتویں جلد میں جنیوا پر مقالہ لکھا تھا۔ یہ جلد 1757ء کے موسم خزاں میں شائع ہوئی۔ اس کے مقالہ میں دو ایسی باتیں تھیں جو غالباً والتیئر کے ایما پر لکھی گئی تھیں اور وہ روسو کو پسند نہ آئی تھیں ممکن ہے کہ وہ خاموش رہتا لیکن انہی دونوں سوفی کے رومان کے حوالہ سے وہ دیدرو اور بعض دوسرے لوگوں سے ناراض تھا اور اب اپنی ناراضگی کا کھلے عام اظہار کرنا چاہتا تھا۔ شاید یوں کہنا چاہئے کہ وہ ناراضگی کے اظہار کے موقع کی تلاش میں تھا اور اس تلاش میں آلمبیر کا مقالہ اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ یوں اس نے آلمبیر پر مکتوب کے پردے میں ایک طویل تنقیدی مضمون لکھ ڈالا۔

ان دو باتوں میں سے ایک جنیوا کے پادریوں کی کینہ پرور تعریف تھی۔ آلمبیر نے بظاہر پادریوں کی تعریف کی تھی۔ مگر اصل میں ان کا مذاق اڑایا تھا۔ دوسری بات کا تعلق جنیوا میں ایک تھیٹر کے قیام سے تھا۔ روسو نے پادریوں کا معاملہ تو ان پر چھوڑا۔ اس نے اپنی جوابی تحریر میں زیادہ توجہ عوامی تفریح کے مسئلہ پر دی اور اس ضمن میں تھیٹر کا مسئلہ بھی اٹھایا۔ اس نے تھیٹر اور اداکاروں پر کڑی نکتہ چینی کی اور لکھا کہ تھیٹر ایسی عیاشی ہے جس کے متحمل صرف بادشاہ اور امرا ہی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اس کو زیادہ رواج دینے سے گریز کرنا چاہئے۔ اس کے بجائے چھوٹی جمہوریتوں کو تفریح کے ایسے ذرائع پر توجہ دینی چاہئے جو ان کے معاشرے کے تقاضوں اور وسائل کے اعتبار سے موزوں ہوں............ جیسے میلے ٹھیلے، عوامی

رقص، موسیقی کی تقاریب، جسمانی کھیل اور فوجی پریڈیں وغیرہ............ یعنی وہ تفریحی تقریباً جو کھلی جگہوں پر منعقد ہو سکیں۔

مونٹ مورنسی کی دلکش وادی میں منتقل ہونے کے بعد روسو کو اس سوسائٹی کی کمی محسوس ہوتی رہی جو وہ پیرس میں چھوڑ آیا تھا۔ اس نے اس کمی کا اعتراف کم ہی کیا ہے۔ مگر وہ پیرس میں بیتے ہوئے اچھے دنوں اور خوشگوار واقعات کو یاد کرتا رہا اور اس کا تخیل ان دنوں کا اور بھی زیادہ خوبصورت بنا کر پیش کرتا رہا۔

سوفی کے رومان کا قصہ ختم ہوا اور المبیر پر بھی غصہ نکالا جا چکا تھا۔ روسو ناول لکھنے کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ ناول ''نویل ایلواز'' کے عنوان سے دسمبر 1760ء میں شائع ہو کر بازار میں آیا۔ اس ناول نے گویا دھوم مچا دی۔ اس کے شائع ہوتے ہی روس کی شہرت آسمان سے باتیں کرنے لگی۔

یہ دعویٰ کرنے میں مبالغہ کم ہی ہو گا کہ بہت سے لوگوں نے اور خود روسو نے بھی اس ناول کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ وہ ہم کو جتلاتا ہے کہ یہ ناول لکھتے ہوئے اس کو حقیقی مسرت سے لبریز ہونے کا احساس رہتا تھا۔ دن بھر وہ مونٹ مورنسی کے جنگلوں میں آوارہ گردی کرتے، کاغذ اور قلم اس کے پاس ہوتے۔ کبھی کبھی وہ ذہن میں آنے والے خیالات نوٹ کر لیتا۔ تریزے اس کے ہمراہ ہوتی۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلتی رہتی۔ سہ پہر کو گھر لوٹنے پر وہ شوخ رنگ کے ربن میں بندھے ہوئے بہترین کاغذ کھولتا اور ان پر دن بھر کے خیالات اور جذبات درج کرا دیتا۔ رات کو وہ اپنی تحریر بیوی اور ساس کو پڑھ کر سناتا۔ ماں بیٹی خاموشی سے سنتیں۔ کبھی کبھی لگتا تھا کہ ان پر کچھ نہ کچھ اثر ہو رہا ہے۔

یہ سادہ اور دل گداز انداز میں لکھا ہوا ناول ہے۔ روسو نے اس سے فطری مناظر کی دل موہ لینے والی تصویر کشی کی ہے۔ بلاشبہ فطری مناظر کے لئے اس کا ذوق بے مثال تھا۔ جبکہ اس کے بگڑے ہوئے احساسات اور اخلاقی ذوق سچائی اور فطرت دونوں سے دور تھے۔

روسو کے سوانح نگار جان مورلے نے اس ناول کی مقبولیت کا حال قلمبند کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''نویل ایلواز'' کی اشاعت کے ساتھ ہی فرانس میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی تھی اور ایک جذباتی طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ خاص طور پر عورتیں اس ناول کی

دیوانی ہوئے جا رہی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ 1760ء سے انقلاب فرانس کے درمیانی عرصہ کی عورتیں اس ناول کے ساتھ ساتھ اس کے مصنف پر بھی مرنے لگی تھیں۔ اگر ان میں سے کسی کو روسو کا جھوٹا پانی پینے کو مل جاتا تو وہ اس کو خوش بختی کی انتہا جانتی اور اس کے لئے کوئی قیمت بھی ادا کرنے پر خوشی سے تیار ہو جاتی۔ اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا کاغذ ان کے ہاتھ لگ جاتا تو چوم چوم کر اس کا ستیاناس کر دیتیں۔ کسی عورت کے دل میں یہ بات اتر جاتی کہ روسو اس کی محبت کا جواب محبت سے دے گا تو وہ اپنی زندگی اس کے لیے وقف کرنے پر ذرا نہ ہچکچاتی۔ کتاب کی مانگ کا حال یہ تھا کہ ناشر فرمائشیں پوری نہ کر پاتے تھے۔ کئی جگہوں پر یہ کتاب لوگوں کو صرف ایک ایک گھنٹے کے لئے دی جاتی تھی۔ کتاب کی مقبولیت عورتوں اور نوجوانوں تک محدود نہ تھی۔ سبھی طبقے اس کے دیوانے ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ درباری، سپاہی، وکیل اور فنکار بھی اس ناول پر فدا ہو رہے تھے۔ اس ناول سے اہل مذہب کے لگاؤ کا حال جاننا ہو تو بشپ وربرٹن اور بشپ ہرڈ سے رجوع کیجئے۔ انہوں نے اپنی خط و کتابت میں اس ناول کا خوب چرچا کیا ہے اور یہ خط و کتابت شائع ہو چکی ہے۔

اس ناول کے چاہنے والوں کے کئی قصے مشہور ہوئے تھے۔ کہتے ہیں کہ رقص و سرور کی محفلوں میں جانے کی تیاری کرنے والی مہذب اور شائستہ خواتین اس ناول میں کھو جاتی تھیں۔ آدھی آدھی رات تک وہ یہ ناول پڑھتی رہتیں اور جب ان کو بتایا جاتا کہ ان کو لے جانے کے لئے بگھی تیار ہے تو جواب میں زبان سے ایک لفظ بھی نکالتیں۔ ان کو جتلایا جاتا کہ رات کے دو بج چکے ہیں تو بھی ان کا شوق کم نہ ہوتا۔ یہاں تک کہ صبح کاذب کے وقت وہ گھوڑوں سے نکالنے کا حکم دیتیں اور ناول کا باقی حصہ پڑھنے کے لئے بستر میں گھس جاتیں۔

یہ رومانوی مقبولیت پیرس یا فرانس تک محدود نہ تھی۔ جرمنی میں مقبولیت کا ایک واقعہ امر ہو چکا ہے اور درجنوں کتابوں میں دہرایا گیا ہے۔ اس واقعہ کا تعلق جرمنی کے عظیم فلسفی ایمانول کانٹ سے ہے۔ وہ وقت کا اس قدر پابند تھا کہ روزانہ جب سیر کے لئے گھر سے نکلتا تو لوگ اس کو دیکھ کر گھڑیوں میں وقت ٹھیک کر لیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ برسوں سے جاری تھا مگر ایک روز کانٹ مقررہ وقت پر سیر کے لئے نہ نکل سکا۔ اس روز وہ روسو کا یہ ناول پڑھ رہا تھا۔

''نویل ایلواز'' نے یورپی ادب پر اثر ڈالا ہے۔ گوئٹے کے مشہور ناول ''نوجوان ورتھر کی داستان غم'' پر اس کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ خود پرست بائرن بھی اس ناول کے مداحوں میں شامل تھا۔ یہ تو دو مشہور مثالیں ہیں ورنہ ادبی نقادوں نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے بتہ سے یورپی شاعروں اور ناول نگاروں پر روسو کے ناول کے اثرات تلاش کیے ہیں۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں تک وہ ایک ایسا ناول رہا جس کو دور اندیش مائیں نوجوان بیٹیوں سے چھپا کر رکھتیں اور جس کو دوشیزائیں چھپ کر پڑھا کرتی تھیں۔

یہ ناول ہے کیا؟ میں نے اس کا خلاصہ تیار کیا تو وہ آٹھ صفحوں پر پھیلا ہوا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس باب کو اپنے قارئین کے لئے زیادہ طویل کروں۔ ڈاکٹر محمود حسین مرحوم نے اس معاملے میں میری مدد کی ہے۔ انہوں نے روسو کی کتاب ''معاہدہ عمرانی'' کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور اس ترجمے کے دیباچے میں اس ناول کا خلاصہ چند سطروں میں بہت خوبی سے پیش کر دیا ہے۔ تو آیئے ہم کیوں نہ ان کی محنت سے فائدہ اٹھائیں اور دیکھیں کہ وہ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ اس ناول میں روسو کا مقصد سچے عشق کی تصویر کشی ہے اور عشق سے اس کی مراد اس انسان کی بے غرض محبت ہے جو ابھی تہذیب و تمدن سے ناآشنا ہو۔ ناول کی ہیروئن ژولی نیک اطوار دوشیزہ ہے جو اپنے دل کی آواز کے سامنے عقل کی بات نہیں سنتی۔ تن، من، دھن، سب کچھ وہ اپنے محبوب پر نثار کرنے پر آمادہ ہے مگر ژولی کے عالی خاندان کو یہ گوارا نہیں ہے کہ ان کی بیٹی ایک معمولی گھرانے کے نوجوان کے ساتھ بیاہی جائے۔ ژولی کو اب دو صورتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے یا وہ اپنے والدین کی دل دکھانے والی نافرمانی کرے یا اپنے محبوب سے جدا ہو جائے۔ ژولی نے دوسری صورت چن لی۔ چنانچہ اس کی شادی والدین کی مرضی کے مطابق ایک اور شخص سے ہو گئی۔ شادی کے بعض کا احساس عشق کے جذبہ کو دبا دیتا ہے۔ روسو کا مقصد عشق کے خلوص اور حق کی جتلانا ہی نہ تھا۔ وہ نکاح کے احترام اور میاں بیوی کی باہمی وفاداری پر بھی زور دینا چاہتا تھا کیونکہ اس زمانے کے فرانس کے اچھے تعلیم یافتہ گھرانوں میں نوجوان لڑکیوں کے ساتھ تو سختی برتی جاتی تھی مگر شادی شدہ عورتوں کو بہت آزادی حاصل تھی۔ روسو اس رویے کے

خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے، مگر ان دونوں تخیلات، یعنی حق محبت اور احترام نکاح کو یکجا پیش کرنا ذرا مشکل اور ژولی کی شخصیت میں گوروسو نے دنوں رجحانات جمع کیئے ہیں مگر یہ یکجائی بالکل ظاہری اور بہت سطحی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ایک موقع پر جسے ناول کا ''بیت الغزل'' کہنا چاہئے۔ ژولی کے سینے کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ جب وہ زندگی کے آخری سانس لے رہی ہے تو کہتی ہے کہ دراصل عشق اسے اپنے شوہر سے نہیں بلکہ پہلے محبوب ہی سے تھا۔ وہ نوجوانی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے اور اس سوال کا جواب ہم کو ناول سے نہیں ملتا کہ اگر اسکی زندگی وفا کرتی تو کیا پیش آتا۔

یہاں یہ بتانے میں کیا حرج ہے کہ یہ ناول محبت ناموں پر مشتمل ہے اور محبت نامے بنیادی طور پر ان دو افراد کے لئے پرکشش ہوتے ہیں جن میں سے ایک لکھتا ہے اور دوسرا وہ جس کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ دوسروں کو ان میں دلچسپی کم ہتوی ہے۔ اکثر لوگوں کے لئے وہ بے لطف اور بیزار کرنے والے ہی ہوتے ہیں۔ ہوشیار روسو کو اس امر کا احساس تھا چنانچہ اس نے کئی غیر ضروری واقعات اور کردار بھی ناول میں شامل کر دیئے ہیں۔ ژولی کی شادی، ساں پیرو کا پیرس کا سفر اور لامیلارے کی طرف اس کی واپسی اور پھر ژولی کی موت بنیادی طور پر وہ مواد ہے جو ناول کو زیادہ دلچسپ اور توجہ کے قابل بنانے کے لئے شامل کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ روسو اس معاملے میں کامیاب رہا ہے۔

اس ناول کو سوفی کے ساتھ روسو کے رومان کے پس منظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ کئی نقادوں اور سوانح نگاروں نے ناول کی توجیہ اس حوالے سے کی ہے۔ روسو ہم کو یقین دلاتا ہے کہ وہ زندگی میں بس ایک ہی بار محبت میں مبتلا ہوا تھا کہ وہ سوفی کی محبت تھی۔ یہی بات اس نے سوفی کو جتلائی تھی، مگر خدا ہی جانتا ہے کہ اس نے یہ جملہ کتنی بار اور کتنی عورتوں کے لئے دہرایا ہو گا۔ جی ہاں! وہ صاحب دل شخص تھا۔ جذبوں کی دنیا میں رہتا تھا۔ جذبے ہی اس کی ذہنی فضا پر چھائے ہوئے تھے۔ اس کی اپنی تحریروں سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ زیادہ نہیں تو سات آٹھ عورتیں اس کی زندگی میں پہلے ہی آ چکی تھیں۔

پھولوں اور درختوں کی وادی میں دل میں پروان چڑھنے والی اس محبت کا روسو نے ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دوشیزہ خود اس کی طرف کھینچی چلی آتی تھی۔ پہل اس نے کی تھی اور وہ محبت کا سلوک کرتی تھی۔ اگر ہم اس تذکرے کو بین السطور پڑھنا چاہیں تو لگتا

ہے کہ سوفی کے برتاؤ میں معصومیت تو تھی مگر اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والی دوشیزہ کا روس کے ساتھ رویہ مربیانہ تھا۔ وہ گویا سرپرستی کر رہی تھی جس کو روسو نے محبت سمجھا۔ سوفی کو چاہنے والے سیاں لامبریت کو روسو کے ساتھ اس کا میل جول اچھا نہ لگا اور وہ اپنی محبوبہ کو ہمارے فلسفی سے دور رکھنے لگا۔ کچھ ہی عرصہ بعد مادام اپنے کے ساتھ روسو کا جھگڑا ہو گیا جو روسو کے اکثر دوسرے جھگڑوں کی طرح کسی معقول بنیاد سے محروم تھا۔ بس پھر کیا تھا، وہ خطوط بھی بدزبانی پر اتر آیا۔ مادام خود بھی اس زمانے کی معروف مصنفہ تھی۔ روسو نے ایک خط میں اس کو لکھا کہ جو حالات پیدا ہو گئے ہیں، وہ اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ وہ مادام کے دیئے ہوئے مکان کو فوراً خالی کر دے۔ مادام بھی غصے میں تھی۔ اس نے جواب میں لکھا کہ اگر اس کی مرضی یہی ہے تو پھر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ روسو نے دوسرے خط میں لکھا کہ وہ اس قسم کا جواب پا کر ایک ہفتہ بھی اس مکان میں نہیں رہ سکتا۔

جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں وہ واقعی مونٹ مورنسی میں ایک اور مکان میں منتقل ہو گیا۔ یہی وہ دن تھے کہ جب دیدرو، گرم اور انسائیکلو پیڈیا سے تعلق رکھنے والے دیگر احباب کے ساتھ اس کے تعلقات زیادہ خراب ہو گئے تھے۔ اعترافات، میں تو اس نے ان لوگوں کے خوب لتے لئے ہیں۔ وہ ان پر سازش کا الزام لگاتا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ اس کے خلاف کسی قسم کی سازش کر رہے تھے۔ البتہ سازش کا ایک ثبوت وہ یہ دیتا ہے کہ دیدرو اور گرم دونوں تریزے کی ماں سے ملتے رہتے تھے۔ مگر اس بات سے یہ نتیجہ کیونکر نکلتا ہے کہ وہ روسو کے خلاف کسی سازش میں مشغول ہے۔ ہمارے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ اس کے ذہن میں ایک موہوم سا شبہ یہ تھا کہ لوگ اس کی شہرت اور مقبولیت پر حسد کرتے ہیں لہٰذا اس کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں اور اس کو احمق ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

روسو نے گرم کے ایک خط کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ خط نفرت اور دشمنی سے بھرا ہوا ہے اور یہ بھی ظاہر کرنا ہے کہ گرم دوستی کا تعلق برقرار نہ رکھنا چاہتا تھا۔ تاہم ساتھ ہی وہ یہ بھی کہنا ہے کہ اگرچہ یہ خط اس کے نام تھا لیکن اس نے پورا خط پڑھنے کی تکلیف گوارا نہ کی تھی۔ بلکہ خط کا ابتدائی حصہ پڑھنے کے بعد تیز و تند جوابی خط کے ساتھ گرم کو واپس بھیج دیا تھا۔ خدا بھلا کرے مادام ایسپنے کا جس نے اپنی یادداشتوں میں یہ خط شائع کر دیا۔ اس

خط میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس کا روسو نے گلہ کیا تھا اور جس کو وہ دوستی کے خاتمے کی ڈونڈی قرار دیتا تھا۔ لہٰذا اس معاملے میں ہم روسو کو ہی الزام دیں گے۔ سچی بات یہ ہے کہ زندگی کے بہت سے معاملات میں اور خاص طور پر دوسروں کے ساتھ تعلقات میں اس کا رویہ اکثر اوقات غیر متوازن ہوا کرتا تھا۔

خیر، ناول کی اشاعت کے بعد اب روسو کی قائم رہنے والی شہرت اور عارضی خوشحالی کے دن شروع ہو گئے تھے۔ ناول کی فروخت سے روسو کے پاس تین ہزار فرانک جمع ہو گئے۔ یہ رقم روسو کے معیار زندگی کے حوالے سے اچھی خاصی تھی۔ تاہم پہلے کے مقابلے میں بہتر مالی حالات اور مونٹ مورنسی جیسے صحت افزا علاقے میں قیام کے باوجود اس کی صحت بگڑتی جا رہی تھی اور وہ پریشان رہنے لگا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر اس نے لکھا تھا کہ ''میری تکلیفیں دردناک ہو گئی ہیں۔ دن ہو یا رات، ایک پل چین نہیں آتا، یہ تکلیف حد سے بڑھتی جا رہی ہے۔''

ناکام عشق، جسمانی تکالیف اور دوستوں کے ساتھ جھگڑوں کے باوجود مونٹ مورنسی میں روسو کا چھ سالہ قیام اس کی تخلیقی زندگی کا بہترین زمانہ ثابت ہوا۔ اس نے اپنا ناول وہیں مکمل کیا۔ علاوہ ازیں وہ دو اور کتابوں پر بھی کام کر رہا تھا جو 1762ء میں چند دنوں کے وقفے کے بعد یکے بعد دیگرے شائع ہوئیں۔ یہ دونوں کتابیں شاہکار مانی جاتی ہیں اور آج اٹھارہویں صدی کے اس فلسفی کا نام زیادہ تر انہی دو کتابوں کی وجہ سے زندہ ہے۔ ان میں سے پہلی کتاب معاہدہ عمرانی اور دوسری ایمیل ہے۔ 1762ء کے اپریل اور مئی کے مہینوں میں شائع ہونے والی ان کتب کا ذکر ہم آئندہ دو ابواب میں کریں گے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان دونوں کتابوں کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔

''معاہدہ عمرانی'' کا ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین نے کیا اور وہ پہلی بار 1935ء میں جامعہ ملیہ دہلی سے شائع ہوا۔ یہ ترجمہ آسان سلیس زبان میں ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اردو اکیڈمی سندھ اور کراچی یونیورسٹی نے بھی اس کے ایڈیشن شائع کئے تھے۔ اس کتاب کا اب تک کا آخری ایڈیشن مقتدرہ قومی زبان نے شائع کیا ہے۔ دوسری کتاب ''ایمیل'' کا ترجمہ مولانا عبدالسلام ندوی نے ''التربیتہ الاستقلالیہ'' کے بوجھل عنوان سے کیا اور وہ 1926ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف سے شائع ہوا۔ یہ ترجمہ اب دستیاب نہیں

ہے۔ممکن ہے کسی لائبریری میں یا کسی نجی ذخیرہ کتب میں موجود ہو لیکن ''ایمیل'' جیسے کومل عنوان کو مولانا ندوی نے جس طرح بیزار کن حد تک بوجھل عنوان میں بدلا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہیکہ یہ مشکل اور بوسیدہ قسم کا ترجمہ ہو گا۔شاید اسی لئے کسی ناشر نے اس کو دوبارہ شائع کرنے میں دلچسپی نہیں لی۔

معاہدہ عمرانی

''معاہدہ عمرانی'' بلاشبہ روسو کی مشہور ترین کتاب ہے مگر دوسری عہد ساز کتابوں کی طرح یہ بھی ایک ایسی کتاب ہے جس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے والے بہت سے ہیں اور ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو اس کو فضول سی کتاب قرار دیتے ہیں اور یہاں تک کہہ ڈالتے ہیں کہ سیاسی موضوعات اور تصورات پر مناسب غور و فکر کرنے میں روسو کی نااہلی کو ثابت کرنے کے لئے یہ کتاب ناقابل تردید ثبوت ہے۔ وہ اس کو احمقانہ خیالات، جذباتی بیانات اور تضادات کا شاہکار ٹھہراتے ہیں۔

سچ کیا ہے؟

بہت سے دوسرے معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی سچ کا دارومدار آپ کے نقطہ نظر پر ہے۔ آپ اس کتاب کا مطالعہ ہمدردانہ نقطہ نظر سے کریں تو یہ سیاسی اور انفرادی آزادی اور نئے سیاسی نظام کی بنیادی دستاویز معلوم ہوگی اور آپ دیکھیں گے کہ اس کا مصنف فہم و دانش کے موتی لٹا رہا ہے لیکن نقطہ نظر میں تبدیلی سے کتاب اور مصنف دونوں کے بارے میں احساس بھی بدل جائے گا۔

خیر! آیئے ہم کتاب کی طرف رخ کریں۔ کم و بیش ڈرامائی انداز میں مصنف بالکل ابتدا ہی میں ہم کو بتاتا ہے کہ اس کی ''مختصر کتاب ایک بڑی تصنیف سے ماخوذ ہے جو میں نے اب سے بہت پہلے اپنی استعداد کا اندازہ کئے بغیر شروع کی تھی اور مدت ہوئی ناتمام چھوڑ دی۔ اس میں سے جو اجزاء منتخب ہونے کے لائق تھے، ان میں سے یہ انتخاب

سب سے زیادہ توجہ کے قابل ہے اور پبلک کی نذر کے لئے مجھے سب سے کم ناموزوں معلوم ہوتا ہے اس انتخاب کے سوا بقیہ کتاب کا وجود دنیا میں نہیں ہے۔"

یہ ثابت ہے تو بقیہ کتاب کا کیا ہوا؟ کیا روسو نے اپنے مسودے خود اپنے ہاتھوں سے ضائع کر دیتے تھے؟ ان کو نذر آتش کر ڈالا تھا؟ روسو نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ہی محققین نے کوئی تسلی بخش جواب دیا ہے لہٰذا ہم اس مسئلے کو یہیں چھوڑ کر آگے بڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ روسو نے کس مقصد کے پیش نظر یہ کتاب لکھی تھی۔

مقصد کا بیان کتاب کے تعارف میں ملتا ہے۔ یہاں مصنف ہم کو بتاتا ہے کہ "میں اس مسئلہ کی تحقیق کرنا چاہتا ہوں کہ اگر انسان کو اسی حالت پر فرض کر لیا جائے جیسا کہ وہ واقعی ہے اور قوانین کو ایسا فرض کیا جائے جیسا کہ انہیں ہونا چاہئے تو کیا ملکی معاملات کے لئے کوئی منصفانہ اور یقینی اصول حکومت مقرر کرنا ممکن ہے؟ اس تحقیق میں میری برابر یہ کوشش رہے گی کہ ثابت کروں کہ حق جس چیز کو جائز قرار دیتا ہے مفاد بھی اسی کا متقاضی ہے تاکہ عدل کو مفاد سے الگ نہ کیا جا سکے۔

"اپنے موضوع کی اہمیت ظاہر کئے بغیر میں اس مسئلہ پر قلم اٹھاتا ہوں۔ مجھ سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ تو کوئی بادشاہ یا قانون ساز ہے کہ سیاست پر کتاب لکھنے بیٹھا جائے؟ میں جواب دوں گا کہ میں ان میں سے کچھ بھی نہیں اور اسی سبب سے میں نے سیاسیات پر قلم اٹھایا ہے۔ اگر میں بادشاہ یا قانون ساز ہوتا تو یہ کہنے میں وقت ضائع نہ کرتا کہ کیا کرنا چاہئے بلکہ جو کچھ کرنا تھا، کر دکھاتا یا خاموش رہتا۔"

یہ اقتباس ہم نے روسو کی مذکورہ کتاب کے اس اردو ترجمہ سے لیا ہے جو ڈاکٹر محمود حسین نے کیا ہے۔ اس باب میں ہم ڈاکٹر صاحب کے ترجمے پر انحصار کریں گے۔ کتاب کا آغاز ان مشہور جملوں سے ہوتا ہے جو دو صدیوں سے زیادہ گزر جانے کے باوجود دنیا بھر کے اکثر پڑھے لکھے لوگوں کو زبانی یاد ہیں۔ آیئے ہم ان پر ایک نظر ڈال لیں۔ روسو لکھتا ہے کہ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جدھر دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے۔ یہ تبدیلی کیسے واقع ہوئی؟ مجھے اس کا علم نہیں۔ کون سی چیز اسے جائز بنا سکتی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ میں اس سوال کا تشفی بخش جواب دے سکتا ہوں۔

"اگر میں اس تبدیلی کے جائز ہونے کا سبب صرف قوت اور اس کے نتائج کو قرار

دوں تو کہوں گا کہ جب تک کوئی قوم اطاعت پر مجبور ہو اور اطاعت کرتی رہے اچھا ہے مگر جونہی یہ اپنے جوئے کو کاندھے سے اتار پھینکنے کے قابل ہو جائے تو اور بھی اچھا ہے کیونکہ جس حق سے کسی قوم کی آزادی چھینی جاتی ہے، اس حق کی بنیاد پر اگر وہ اپنی آزادی واپس لے لے تو یا قوم اس کے واپس لے لینے میں حق بجانب ہے یا پھر اس کو آزادی سے محروم کرنا ناجائز تھا۔ لیکن نظم عمرانی ایک مقدس حق ہے جو تمام دوسرے حقوق کی بنیاد ہے، تاہم یہ حق فطری نہیں بلکہ عہد و پیمان پر مبنی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ عہد و پیمان ہیں کیا؟''

بات کو آگے بڑھاتے ہوئے روسو کہتا ہے کہ کوئی حق قوت کی بنیاد پر قائم نہیں ہو سکتا اور نہ ہی جائز قوتوں کے سوا کسی اور کی اطاعت ہم پر فرض ہے۔ آیئے ہم اس کا استدلال بھی دیکھ لیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ''جو کوئی برسر اقتدار ہو اس کی اطاعت کرو۔'' اگر اس جملہ کے معنی یہ ہیں کہ زور قوت کے آگے سر تسلیم خم کرو تو یہ نصیحت اچھی تو ہے مگر غیر ضروری بھی ہے کیونکہ میرے خیال میں تو اس نصیحت کی خلاف ورزی کبھی بھی نہ ہو گی۔ میں مانتا ہوں کہ تمام قوت کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے مگر ہر مرض بھی تو اسی کی جانب سے ہے۔ تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ طبیب کی طرف رجوع کرنا ممنوع ہے؟ اگر جنگل میں کوئی ڈاکو مجھے آن گھیرے تو ظاہر ہے کہ مجبوری میں اپنی روپوں کی تھیلی مجھے اس کے حوالے کرنا پڑے گی لیکن کیا ازروئے اخلاق بھی یہ میرا فرض ہو گا کہ اگر میں تھیلی چھپا سکتا ہوں، تب بھی اسے نکال کر اس کی نذر کروں، اس لئے کہ ڈاکو کا طمانچہ یقیناً ایک برتر قوت ہے۔

''ہمیں ماننا پڑے گا کہ قوت کی بنا پر حق قائم نہیں ہوتا اور جائز قوتوں کے سوا کسی کی اطاعت ہم پر فرض نہیں ہے۔ اس صورت میں ہر پھر کر میرا پہلا اور اصلی سوال سامنے آتا ہے۔''

بات اب زیادہ واضح ہو جاتی ہے چونکہ فطرت کے اعتبار سے ایک انسان کو دوسرے انسان پر حاکمیت روا نہیں اور چونکہ قوت حق کی بنیاد نہیں لہٰذا تمام جائز حاکمیت کی بنیاد عہد و پیمان یا سادہ لفظوں میں یوں کہئے کہ معاہدے قرار پاتے ہیں۔ اسی معاہدے کو روسو نے سماجی یا عمرانی معاہدہ کا نام دیا ہے۔ اس کے ذہن میں اس معاہدہ کا جو تصور تھا، اس کو مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہر فرد پوری جماعت کے حق میں اپنی ذات اور اپنے تمام حقوق سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ چونکہ ہر شخص اپنے آپ کو مکمل طور پر

دوسروں کے حوالے کر دیتا ہے، اس لئے ان میں سے ہر ایک کے لئے بالکل ایک سی شرائط ہوتی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص شرائط کو دوسروں کے لئے سخت بنانا چاہے تو یہ بات خود اس کے اپنے مفاد کے بھی خلاف پڑتی ہے۔

اس نکتے کی وضاحت کے لئے روسو کہتا ہے کہ چونکہ حقوق سے دست برداری پوری پوری ہوتی ہے لہٰذا اتحاد بھی ایسا مکمل ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ مکمل اتحاد ہونا ممکن ہی نہیں۔ کسی بھی شریک کو طلب کرنے کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا۔ اس لئے اگر افراد بعض حقوق سے دست بردار نہ ہوں تو ایسی صورت میں چونکہ طرفین کسی نہ کسی بات پر اپنے حکم آپ ہوں گے اس لئے وہ پھر ہر بات کا فیصلہ خود کرنا چاہئیں گے۔ اس صورت میں فطری زندگی برقرار رہے گی اور جماعت لازمی طور پر یا تو بے کار رہ جائے گی یا استبداد پر اتر آئے گی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب ہر شخص اپنے آپ کو اجتماع کی نذر کرتا ہے تو وہ دراصل اپنے آپ کو کسی کی نذر نہیں کرتا چونکہ ہر شریک پر اس کا اتنا ہی حق ہے جتنا اس پر دوسرے شرکاء کا ہے لہٰذا ہر وہ چیز جس سے وہ دست بردار ہوتا ہے اس کے عوض وہ اس کے برابر کی چیز حاصل کر لیتا ہے اور اپنی جان و مال کی حفاظت کے لئے اس کی قوت بڑھ جاتی ہے۔

اس بحث سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے روسو کہتا ہے کہ مختصر ترین الفاظ میں ہم سماجی معاہدہ کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ ''ہم میں سے ہر ایک مشترکہ طور پر اپنی ذات اور اپنی تمام قوت کو ارادہ اجتماعی کے حوالے کرتا ہے اور اس کے عوض ہم میں سے ہر فرد کل کا جزو لاینفک بن جاتا ہے۔

روسو ہم کو یقین دلاتا ہے کہ فریقین کی انفرادی شخصیات باقی نہیں رہتیں اس کے بجائے معاہدے کی بنا پر ایک اخلاقی اور اجتماعی شخصیت جنم لیتی ہے جو اسی قدر ارکان سے عبارت ہوتی ہے جس قدر مجلس میں آراء کی تعداد ہوتی ہے اور اس معاہدے سے اس کو یگانگت، یکسانیت، زندگی اور ارادہ سب حاصل ہوتے ہیں اس مجموعی شخصیت کا نام جو دوسری شخصیتوں کے باہمی اتحاد سے ظہور میں آتی ہے، پہلے ''شہر'' ہوا کرتا تھا اور اب سے ''جمہوریہ'' یا ''ہیت سیاسیہ'' کہتے ہیں۔ اس کے ارکان حالات منفعلی میں اسے ''ریاست''

کہتے ہیں اور حالت فاعلی میں ''فرماں روا'' اور جب وہ اس کا دوسری ہم جنس جماعتوں سے مقابلہ کرتے ہیں تو اسے ''طاقت کہتے ہیں۔ وہ لوگ جو اس میں مجتمع ہیں، انہیں مجموعی حیثیت سے ''قوم'' کہا جاتا ہے اور انفرادی طور پر قوت۔فرماں رواں کے شریک کی حیثیت سے شہری اور چونکہ وہ ریاست کے قوانین کے ماتحت ہوتے ہیں لہٰذا اس حیثیت سے انہیں ''رعایا'' کہا جاتا ہے مگر ان اصطلاحات میں اکثر خلط ملط ہو جاتا ہے اور ایک کی جگہ دوسری استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ کافی ہے کہ جب معین معنی میں یہ اصطلاحیں استعمال کی جائیں تو ہم ان میں تمیز کر سکیں۔

''معاہدہ عمرانی'' میں دراصل روسو نے فرد کو بطور شہری پیش نظر رکھا ہے اور اس کا مقصد شہری کی آزادی کی حفاظت کرنا ہے۔ اس آزادی کو ہر وقت سماجی رشتوں اور سیاسی اداروں سے خطرات لاحق رہتے ہیں۔ روسو کا کہنا ہے کہ اعلیٰ ترین چیز اتھارٹی نہیں بلکہ آزادی ہے۔ اتھارٹی کے سارے روابط کم و بیش ہی بے قاعدہ اور من مانے ہوتے ہیں یا بن جاتے ہیں انسانوں کے درمیان محتاجی نظم یا قاعدہ کے بغیر ہوتی ہے لہٰذا اتھارٹی بتدریج خود کو غالب بنا لیتی ہے اور اطاعت غلامی میں ڈھل جاتی ہے۔اس صورت حال میں آزادی کو بچانے کے لئے انسانوں کے درمیان ایک دوسرے کی غلامی کو لازمی ختم کرنا ہوگا یا اس کو قاعدے قانون کے تحت لانا ہوگا۔

عمرانی معاہدے کی تمام دفعات آخر کار ایک دفعہ ڈھل جاتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ فرد اپنے تمام حقوق سمیت معاشرے کے آگے سر تسیم خم کر دے۔ اس معاہدے کے ذریعے ریاست اپنے تمام ارکان پر مکمل بالادستی قائم کرتی ہے۔ لاک اور مونٹسکو کے برخلاف روسو کوئی ایسا بنیادی قانون پیش نہیں کرتا جو اس خود سپردگی کی حد قائم کرے اور نہ ہی وہ خود مختاری پر کوئی آئینی حد مقرر کرتا ہے۔''معاہدہ عمرانی'' کی اشاعت کے بعد 1764ء کی ایک تحریر میں اس نے صاف لکھا تھا کہ فرماں روا قوت کا جوہر یہ ہے کہ وہ بے پایاں ہے۔ وہ یا تو جملہ قوت و اختیار کی مالک ہے یا پھر کچھ بھی نہیں ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ روسو کا سیاسی نظریہ اختیارات کے کسی توازن سے محروم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ریاست میں برتر طاقت بس ایک ہی ہے اور وہ فرماں روا ہے۔ سب کو اس کی اطاعت کرنی ہے۔ یہ برتر قوت قوانین تبدیل کر سکتی ہے، انتظامیہ کو بدل سکتی ہے اور ریاست کے آئین میں بھی ردوبدل کر سکتی

ہے۔غرض اس کے اختیار میں سب کچھ ہے۔

اس پس منظر میں یہ بات بالکل فہم ہے کہ بہت سے ناقدین نے روسو کو نکتہ چینی اور کڑی تنقید کا ہدف بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ روسو ذکر تو فرد کی آزادی کا کرتا ہے اور اس آزادی کے دفاع کو اپنا مقصد بیان کرتا ہے لیکن درحقیقت وہ آمریت اور اجتماعیت کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اس نے جو سیاسی نظام وضع کیا، وہ فرد، اس کی آزادی اور حقوق کی ضمانت دینے یا ان کی حفاظت کرنے کے بجائے فرد کو جماعت پر قربان کر دیتا ہے۔ اس نظام میں ریاست تمام اختیارات کی مالک بن جاتی ہے اور فرد یا شہری کے دامن میں کچھ بھی نہیں رہتا۔ بہت عرصہ پہلے 1815ء میں روسو کے نظریے کے اس پہلو کو صاف طور پر پہچان لیا گیا تھا۔ چنانچہ بنجامن کانسٹنٹ نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ''معاہدہ عمرانی'' کو عام طور پر انسان کی آزادی کا منشور سمجھا جاتا ہے لیکن روسو کی اس کوتاہی نے اس معاہدے کو آمریت کا سب سے زیادہ خوفناک ہتھیار بنا دیا ہے۔ بعد میں ایسے لوگ بھی آئے جنہوں نے کھلم کھلا یہ کہا کہ روسو ہر قسم کی آمریت اور مطلق العنانیت کے نظریات کا منبع ہے۔ وہ اشتراکی آمریت کا رشتہ بھی اس سے جوڑتے ہیں۔

''معاہدہ عمرانی کی اشاعت کے کچھ عرصہ بعد فرانس میں اس پر جوشیلی بحثیں شروع ہو گئی تھیں۔ اس کے حامی اور مخالفین دونوں میدان میں آ گئے تھے اور اس کتاب میں پیش کئے جانے والے تصورات اور دلائل کی بہت مختلف قسم کی توجیہات پیش کی جانے لگی تھیں۔ ایک جانب کے انتہا پسند اس کتاب کو فرد کی آزادی کا منشور قرار دیتے تھے تو دوسری طرف کے انتہا پسند اس کو شہریوں کو آزادی اور حقوق سے محروم کرنے والی آمریت کا دستور ٹھہراتے۔ فرانس کے علاوہ براعظم یورپ کے دوسرے حصوں میں بھی یہ کتاب بحث و مباحثہ کا موضوع بن گئی۔ انگلستان میں اس پر جوشیلی بحثیں تو نہ ہوئیں جیسے کہ فرانس میں ہوئی تھیں لیکن وہاں اس کو توجہ سے پڑھا گیا۔ انگلستان میں اس کتاب کی تعریف کرنیوالے کم نہ تھے مگر ایسے بھی تھے جنہوں نے اس فرد کی آزادی کا دفاع کرنے والے سترہویں صدی کے انگریز فلسفی جان لاک کے خیالات کی ضد سے تعبیر کیا۔ انہوں نے کہا کہ لاک فرد کے حقوق کا واضح ذکر کرتا ہے اور ان کے تحفظ پر زور دیتا ہے جب کہ روسو کا نظریہ ان حقوق کو پس پشت ڈالتا ہے اور ان کو ملیا میٹ کر دیتا ہے۔ لاک کا نظریہ یہ فرد پرستی کا منشور ہے اور روسو

کا نظریہ اجتماعیت کی ایک انتہا پسند صورت ہے۔ بعض انگریز نقادوں نے روسو کو آمریت کا دفاع کرنے والا قرار دیا۔

یہ توجیہات زیادہ تر ''معاہدہ عمرانی'' کے ان ابواب سے اخذ کی گئی ہیں جن میں روس انفرادی حقوق سے مکمل دست برداری اور ''ریاست کی شہریوں پر مطلق حاکمیت'' کا چرچا کرتا ہے، تاہم ہم کو مان لینا چاہئے کہ اگرچہ یہ توجیہات مکمل طور پر بے بنیاد نہیں ہیں اور روسو کی کتاب میں ایسا مواد موجود ہے جو ان کا معقول حد تک جواز مہیا کر دیتا ہے لیکن یہ توجیہات روسو کے ارادوں سے قطعی طور پر مختلف ہیں۔ اس امر میں شبہ کرنے کی گنجائش کم ہی ہے کہ درحقیقت وہ انسانوں کی آزادی کی حفاظت کرنے اور اس کے لئے معقول جواز تلاش کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ آزادی کو دنیا کی اہم ترین شے سمجھتا تھا اور کہتا تھا کہ آزادی انسان کو فطرت کی طرف سے تحفہ میں ملی ہے اور انسانوں کو قانونی یا کسی اور جائز طریقے سے اس سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا کو ہم یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ آزادی کو بنیادی قدر سے قرار دینے والے روسو کا تجویز کردہ ''معاہدہ عمرانی'' اس کو پامال کرنے کی طرف نہیں جاسکتا۔ علاوہ ازیں یہ بھی تو کہتا ہے کہ عمرانی معاہدے کی صورت میں انسان اپنے حقوق سے صرف ظاہری طور پر دست بردار ہوتا ہے اور آخر کار ان حقوق کو واپس لے لیتا ہے، وہ اصرار کرتاہ ے کہ اس عمل کو دست برداری نہیں بلکہ مفید تبادلہ سمجھنا چاہئے۔ گویا اس کے نزدیک اصل معاملہ یہ ہے کہ عمرانی معاہدہ کے ذریعے افراد کو تہذیب و تمدن کی کیفیت میں وہ تمام حقوق واپس مل جاتے ہیں جو ان کو فطرت کے ماحول میں حاصل تھے۔

آیئے ہم روسو کے نظریات کی توجیہہ اس طور کریں کہ اجتماعی ارادہ کا نظریہ انفرادی حقوق کو ضعف پہنچانے کے بجائے ان کی ضمانت ہے۔ عمرانی معاہدے کے ذریعے افراد خود کو اجتماعی ارادے کی پناہ میں لے آتے ہیں اور روسو کے نزدیک اجتماعی ارادے کو عمل میں لانا ہی اقتدار اعلیٰ ہے۔ روسو نے بادشاہوں اور آمروں کی حاکمیت کو عوام کی حاکمیت سے بدل ڈالا۔ تاہم سچی بات یہ ہے کہ اس سے بھی آزادی کی حفاظت لازمی طور پر نہیں ہوتی۔ یہ مانا کہ حکمران پوری جماعت کو نقصان نہیں پہنچا سکتے کیونکہ اس کا مطلب خود اپنے آپ کو بھی نقصان پہنچانا ہے، تاہم اس بات سے اس امر کی ضمانت مشکل ہی سے ملتی

ہے کہ وہ کسی ایک فرد کو نقصان نہیں پہنچا سکتے یا یہ کہ اکثریت کے مفاد میں اقلیت کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ مثال کے طور پر یہی سبب ہے کہ مونٹسکو نے ''تمام لوگوں کی آمریت'' کا ذکر کیا تھا۔ روسو کے نظام میں اس کی گنجائش موجود نہیں، کیونکہ وہ کہتا ہے کہ اجتماعی ارادہ بھی انفرادی معاملات پر گرفت نہیں کر سکتا۔ جب ایک شہری کے ساتھ ظلم ہوتا ہے تو اصل میں تمام شہریوں کے ساتھ ظلم ہوتا ہے۔ اجتماعی ارادہ کے ذریعے سے تمام شہریوں میں جس طرح مساوات قائم کی جاتی ہے وہ حکمرانوں کی طرف سے اختیارات کے غلط استعمال کے خلاف ڈھال ہے۔ روسو ایک اور دلیل بھی دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب شہری خود کو اجتماعی ارادہ کا پابند کرتا ہے اور اس کے مرتب کردہ قوانین کی اطاعت کرتا ہے تو وہ اصل میں اپنے سوا کسی اور کی اطاعت نہیں کر رہا ہوتا۔ لہٰذا وہ بدستور آزاد رہتا ہے اور اسکی آزادی کے لئے کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوتا۔

یہ استدلال مشکلات سے مبرا نہیں ہے۔ بحث کو آگے لے جائیں تو کئی تضاد سامنے آ سکتے ہیں مگر ہمیں دلائل بازی کو کہیں نہ کہیں روکنا ہوگا اور اس حقیقت کو قبول کرنا ہو گا کہ روسو کا مقصد آزادی کو قربان کرنا نہیں بلکہ اس کی حفاظت کرنا تھا۔ اس کا سیاسی نظریہ مساوات کی راہ ہموار کرنے کے علاوہ حکمرانی کے وراثتی نظام کی نفی بھی کرتا ہے۔ وہ جمہوری ہے اور بادشاہت کا مخالف ہے۔ بلاشبہ اس نے حکمرانی کی مختلف صورتوں کو قبول کیا تھا اور بادشاہت کی بھی صاف طور پر نفی نہ کی تھی لیکن اس کا موقف یہ تھا کہ بادشاہ محض وہ حکام ہوں گے جو قوانین پر عمل درآمد کے ذمہ دار ہوں گے۔ یہ امر بادشاہوں سے وہ تمام مراعات اور حقوق چھین لیتا ہے جسکے لئے وہ ساری دنیا کی تاریخ میں بدنام چلے آتے ہیں۔ اس حوالے سے بادشاہت کا روایتی ادارہ ختم ہو جاتا ہے اور جمہوریت کے لئے جگہ بنتی ہے۔

ریاست اور مذہب

''معاہدہ عمرانی'' کا آخری حصہ مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں روسو نے اپنے سیاسی نظریے کے حوالے سے مذہب مدنی پر بحث کی ہے۔ اس کے سیاسی نظریے کو اس حصے پر توجہ دیئے بغیر بھی سمجھا جا سکتا ہے، لیکن اس باب میں اس کے بعض خیالات توجہ کے قابل ہیں۔ ویسے بھی روسو بنیادی طور پر ایک مذہبی شخص تھا، لہٰذا اس کی شخصیت اور خیالات کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس کے مذہبی خیالات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔

''مذہب مدنی'' کے موضوع پر روسو نے تہذیب و تمدن کی تاریخ میں مذہب کے کردار کا سرسری جائزہ لیا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ اول اول دنیا میں دیوتاؤں کے سوا کوئی بادشاہ نہ تھا اور نہ ہی مذہبی حکومت کے سوا کوئی دوسری حکومت تھی۔ لوگ کلیکولا کی طرح استدلال کرتے تھے۔ پہلی صدی عیسوی سے تعلق رکھنے والے روم کے اس شہنشاہ نے شاہی بتوں کی پوجا کرنے کا حکم صادر کیا تھا۔ اس کا طریق استدلال یہ تھا کہ جس طرح چرواہا اپنے گلے سے افضل ہوتا ہے، اس طرح بادشاہ جو رعایا کے داعی یا چرواہے ہیں رعایا سے افضل ہوتے ہیں۔ اپنی دلیل سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ بادشاہ معبود ہوتے ہیں یا یہ کہ رعایا جانور ہوتی ہے۔ روسو کا کہنا ہے کہ اس زمانے میں یہی طریق استدلال ٹھیک تھا۔ قوم کے جذبات اور تخیلات کو اس طرح متغیر کر دینے کے لئے کہ وہ اپنے ایک ہم جنس کو اپنا حاکم بنانے اور اس سے فلاح کی امید رکھنے پر آمادہ ہو، ایک طویل مدت درکار ہے۔

ہر سیاسی گروہ پر ایک ایک دیوتا مسلط ہوا کرتا تھا۔ لہٰذا جتنی قومیں تھیں، اتنے ہی

معبود ہو گئے۔ دو قومیں جو ایک دوسرے کے لئے اجنبی اور باہم دشمن ہوں وہ کسی ایک آقا کا زیادہ عرصہ تک اتباع نہیں کر سکتیں۔ یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے دو برسر پیکار لشکر ایک قائد کی حکم برداری نہیں کر سکتے۔ قومی تقسیمیں دیوتاؤں کی تعداد کی کثرت کا سبب بنیں اور پھر اس کثرت سے مدنی عدم رواداری نے جنم لیا اور روسو کا دعویٰ ہے کہ یہ دونوں باتیں نفس الامر میں ایک ہی ہیں۔

اچھا تو پھر سوال یہ ہے کہ بت پرستی کے عہد میں جب ریاست کے خاص خاص دیوتا تھے اور ان کی الگ الگ پوجا ہوتی تھی، مذہبی جنگیں کیوں نہیں ہوتی تھیں؟ روسو کے پاس اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ ہر ریاست کا اپنا مخصوص طرز عبادت اور مخصوص طرز حکومت ہوتا تھا اور اس وجہ سے وہ اپنے دیوتاؤں اور قوانین کے درمیان فرق نہ کرتی تھی۔ سیاسی جنگ اور مذہبی جنگ میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ دیوتاؤں کی عملداری گویا قوموں کی ملکی سرحدوں تک محدود ہوتی تھی۔ ایک قوم کے دیوتا کا دوسری اقوام پر کوئی حق نہ ہوتا تھا۔ ان بت پرستوں کے دیوتا حاسد نہ تھے۔ انہوں نے دنیا کی حکومت کو آپس میں بانٹ لیا تھا۔

روسو لکھتا ہے کہ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل بھی کبھی کبھی خدائے اسرائیل کا ذکر کر کے اسی خیال کی تائید کرتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ وہ مغضوب ومقہور کنعانیوں کے خداؤں کو جن کے ملک پر یہ قابض ہوئے، حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن پھر بھی یہ دیکھئے کہ دوسری ہمسایہ قومیں جن کے ملکوں پر حملہ کرنا ممنوع تھا، ان کے دیوتاؤں کا ذکر یہ کس طرح کرتے تھے۔ جفشہ نے اموں پرستوں سے کہا تھا کہ ''کیا تم اپنے معبوں شموس کی ملکیت کے جائز حق دار نہیں؟ ہم تو اپنے فاتح معبود کے حاصل کئے ہوئے علاقوں پر اسی حق سے قابض ہیں۔''

روسو کہتا ہے کہ اس فقرہ میں اس کو اس بات کا صاف اعتراف نظر آتا ہے کہ شموس کے حقوق اور خدائے بنی اسرائیل کے حقوق ایک ہی قسم کے تھے۔

آخر کار جب اہل روما کی سلطنت کی وسعت کے ساتھ ساتھ ان کے دیوتاؤں اور قوانین کو بھی فروغ ہوا اور چونکہ وہ اکثر مفتوحین کے دیوتاؤں کو بھی اختیار کر لیتے تھے لہٰذا اس عظیم الشان سلطنت کی اقوام نے جن کو بلاتفریق حقوق شہریت حاصل ہوتے تھے رفتہ

رفتہ اپنے آپ کو بے شمار دیوتاؤں اور مذہبوں سے گراں بار پایا جو ہر جگہ ایک سے تھے۔ یہی سبب ہے کہ آخر کار بت پرستی کو تمام دنیا میں ایک ہی مذہب سمجھا جانے لگا۔

روسو کے اس تجزیے کا تاریخی حقائق کی روشنی میں جائزہ لینے یا اس پر بحث کرنے یا اس کو درست تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہی سمجھنا کافیہ ے کہ یہ مذہب کے ارتقاء کا اس کا نظریہ ہے۔ اس بحث کے بعد وہ مسیحیت کے ظہور اور اس کے فروغ کا جائزہ لیتا ہے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ مذہب کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک عام انسان کا مذہب ہے اور دوسرا شہری کا۔ عام انسان کا مذہب معبود مطلق کی خالص قلبی عبادت اور اخلاقی فرائض کی ادائیگی تک محدود ہوتا ہے۔ شہری کا مذہب ایک ملک کی چیز ہے۔ اس کے دیوتا اور اولیا اس کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ عقائد، رسوم اور طریق عبادت ملکی قانون کے ذریعہ مقرر کئے جاتے ہیں۔ اس لئے مذہب کو ماننے والی قوم کے سوا باقی سب اس کے نزدیک کافر، اغیار اور وحشی ہوتے ہیں۔ انسانی فرائض اور حقوق صرف اس کی قربان گاہوں تک محدود ہوتے ہیں۔ اگلی اقوام کے تمام مذاہب ایسے ہی تھے جسے اس کے بقول شریعت الٰہی بھی کہا جا سکتا ہے۔ خواہ وہ مدنی ہوں یا موضوعی، لیکن روسو کا کہنا ہے کہ اس قسم کا مذہب انسانوں کو سریع الاعتقاد اور توہم پرست بناتا ہے اور خدا کی سچی عبادت کو بے ہودہ رسوم کے پردے میں مخفی کر دیتا ہے۔

اس قسم کے مذہب میں وہ ایک اور عیب بھی تلاش کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب یہ مذہب تنگ نظری اور جبر و قہر پر اترتا ہے تو قوم کو خونخوار اور جارحانہ بنا دیتا ہے۔ وہ قوم رواداری سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس میں قتل و غارت کی پیاس بھڑک اٹھتی ہے اور جو کوئی اس کے دین کو قبول نہ کرے۔ وہ اس کا خون بہانا ایک مقدس فرض سمجھتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی قوم ہمیشہ دوسری اقوام سے برسر پیکار رہتی ہے اور یہ اس کی اپنی بقا و سلامتی کے لئے بھی خطرے کی بات ہوتی ہے۔

روسو کے نظریہ مذہب کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر سی اے قادر لکھتے ہیں کہ اس کو ایسے مذاہب پسند نہیں جو آپس میں لڑتے جھگڑتے ہوں، کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ سچائی ایک ہے۔ اسے اس امر پر اعتراض نہیں کہ مذاہب کئی ہیں۔ اعتراض تب پیدا ہوتا ہے جب وہ نفرت اور تعصب پھیلاتے ہیں۔ روسو کے خیال میں ہر مذہب میں سچائی کا عنصر موجود ہوتا

ہے۔ خاص طور پر ان کے اخلاقی نظام اور اقدار میں سچائی موجود ہوتی ہے لیکن جب یہ مذاہب الہام کی اجارہ داری کا دعویٰ کرتے ہیں اور دوسرے مذاہب کے پیروکاروں پر ظلم و تشدد کو روا رکھتے ہیں، تب ان کا کردار پسندیدہ نہیں رہتا۔ اس کی ان کو اجازت نہیں ملنی چاہئے۔ کسی مذہب کے ماننے والوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسروں کو زبردستی اپنا ہم نوا بنائیں۔ اگر کسی مذہب میں عالمگیر بننے کی صلاحیت واقعی موجود ہے تو پھر قوت کے استعمال کے بجائے کے بجائے اس کے دلائل کے زور پر اپنا موقف منوانا چاہئے۔ اگر اس کے پاس دلائل موجود نہ ہوں تو پھر کوئی اور طریقہ ممکن نہیں ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ پروٹسٹنٹ سے کیتھولک اور پھر کیتھولک سے پروٹسٹنٹ بننے اور مسیحی زندگی گزارنے والا روسو معاہدہ عمرانی میں مسیحیت کو رد کر دیتا ہے اور الزام لگاتا ہے کہ یہ مذہب محض غلامی کی تعلیم دیتا ہے اور یہ کہ ''اس مذہب کا بنیادی اصول ظالموں اور جابروں کے لئے اس قدر مفید ہے کہ وہ ہمیشہ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے'' وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ''سچے مسیحی غلامی کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو جانتے بھی ہیں مگر پھر بھی نہیں چونکتے۔''

آبائی مذہب کو رد کرنے کا سبب یہ ہے کہ یہاں روسو مذہب کو فرد کے بجائے شہری کے نقطہ نظر سے دیکھ رہا ہے۔ اس حوالے سے وہ مذہب کا اپنا ایک تصور پیش کرتا ہے۔ اس کا موقف یہ ہے کہ ریاست کے لئے یہ بات بہت ضروری ہے کہ اس کے ہر شہری کا مذہب ایسا ہو جس کی وجہ سے اس کو فرض کی ادائیگی میں خوشی مل سکے۔ سوائے اس صورت کے کہ ان کا اثر اخلاق اور ان کے فرائض پر پڑے جو ''حقوق العباد'' سے متعلق ہیں۔ اس سے قطع نظر ہر شخص مرضی کا مذہب چن سکتا ہے۔ ریاست یا حکمران کے لئے اس سے مطلع ہونا ضروری نہیں۔ اس لئے کہ عقبیٰ پر اس کا کوئی عمل دخل نہیں............ یعنی اس وقت تک جب کہ وہ اس دنیا میں اچھے شہری ہوں۔

یوں مذہب کو روسو ایک ایسا نجی معاملہ قرار دیتا ہے کہ جس سے ریاست یا حکمرانوں کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اس کے بعد کو بتاتا ہے کہ ایک خالص سماجی مذہب بھی ہوتا ہے جس کی شریعت مقرر کرنا فرماں رواں کا کام ہے۔ مذاہب کے عقائد کی طرح نہیں، بلکہ سماجی جذبات و احساسات کے طور پر، جن کے بغیر نیک شہری یا وفادار رعایا ہونا ممکن نہیں

ہے۔ فرمانروا ان کی پیروی پر کسی کو مجبور نہیں کر سکتا۔ تاہم وہ ان سے انکار کرنے والوں کو ملک بدر کر سکتا ہے۔ اسکی وجہ یہ نہیں کہ نہ ماننے والے کافر و فاسق ہیں، بلکہ اس کے لئے کہ سماجی مذہب کو نہ ماننے والے غیر مدنی الطبع ہیں۔ وہ قانون اور عدل سے دلی لگاؤ نہیں رکھتے اور ضرورت کے وقت اپنے فرض کی خاطر جان قربان کرنے کے قابل نہیں ہوتے لیکن اگر کوئی شہری ان عقائد کو ایک مرتبہ سب کے سامنے قبول کرنے کے بعد ان سے منکر ہو جائے تو روسو اس کو معاف کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ وہ اسکے لئے سخت ترین سزا تجویز کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ اس قسم کے منکر کو موت کی سزا دینی چاہئے۔ وجہ؟ وجہ یہ ہے کہ روسو کے بقول ایسا شخص دنیا میں سب سے بڑے جرم کا ارتکاب کرتا ہے اور قوانین کے سامنے جھوٹا ثابت ہوتا ہے۔

اس کی تجویز یہ ہے کہ مدنی مذہب کے عقائد سادہ، مختصر، جامع و مانع اور غیر مشرع ہونے چاہئیں۔ ایک قادر، علیم، رؤف و رحیم، عالم الغیب اور کریم خدا کا وجود حشر ون شر، نیکیوں کی جزا، بدکاروں کی سزا، معاہدہ عمرانی اور قوانین کا احترام اس مذہب کے مثبت عقیدے ہیں۔ روسو نے صرف ایک سلبی عقیدہ پیش کیا ہے اور وہ ہے عدم رواداری۔

وہ عدم رواداری سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ یہ عدم رواداری دراصل وہی شے ہے جس کو آج ہم بنیاد پرستی کا عنوان دیتے ہیں۔ وہم کو جتلا دیتا ہے کہ جہاں کہیں مذہبی عدم رواداری کو رواج دیا جاتا ہے، وہاں سیاست پر اس کے منفی نتائج لازمی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ آج کے زمانے میں زندہ ہوتا تو ہمارے ملک کو اپنے نظریے کی صداقت کے ثبوت کے طور پر پیش کرتا، جہاں مذہبی عدم رواداری اور بنیاد پرستی نے سیاست میں زہر گھولنے کے ساتھ ساتھ سماجی تنظیم کو بھی پارہ پارہ کر دیا ہے۔ یہاں درجنوں گروہ پیدا ہو گئے ہیں اور وہ سب ایک دوسرے کے گلے کاٹنے کے درپے ہیں۔ دیکھئے کہ روسو کا یہ نکتہ کس قدر بصیرت انگیز ہے کہ جہاں مذہبی عدم رواداری کو فروغ حاصل ہوتا ہے، وہاں حکمران دنیاوی امور میں بھی حکمران نہیں رہتے، بلکہ پادری اور مولوی اصل اقتدار کے مالک بن جاتے ہیں اور ملک کے حکمرانوں کی حیثیت ان کے گماشتوں کی سی رہ جاتی ہے۔ ہمارے ہاں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ مذہبی رہنما حکمرانوں کا کان پکڑ کر اس راہ پر لے جاتے ہیں، جس راہ پر وہ لے جانا چاہتے ہیں۔

''معاہدہ عمرانی'' کا خاتمہ مذہبی رواداری کی مذمت اور اس سے محفوظ رہنے کی پرزور تلقین پر ہوتا ہے۔

پچھلے اور اس باب میں ہم نے روسو کے اس شاہکار کے بنیادی تصورات پیش کر دیئے ہیں۔ ''معاہدہ عمرانی'' کو ان کتب میں شامل کیا جاتا ہے جو انسانوں کا قیمتی ورثہ ہیں اور جنہوں نے نہ صرف اپنے عہد کو متاثر کیا بلکہ ان کے اثرات کے بعد کے زمانوں میں بھی محسوس کئے جاتے رہے۔ تاہم آپ اس کتاب میں خامیاں اور تضادات ڈھونڈنا چاہیں تو زیادہ دشواری پیش نہ آئے گی۔ گہرے مطالعہ سے آپ یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ بصیرت اور فکری گہرائی کے طور پر اس کتاب میں بعض ایسے نکات بھی پیش کئے گئے ہیں جو سطحی اور عامیانہ ہیں۔ پھر بھی اس کتاب کی اشاعت ایک زبردست واقعہ تھی۔ اس نے فرانس اور یورپ کے بعض دوسرے ملکوں میں ذہنوں کو بہت متاثر کیا۔ اس کتاب کے حوالے سے فلسفی شلر کا کہنا ہے کہ روسو وہ شخص ہے جس نے ''مسیحیوں کو انسان بنا ڈالا ہے۔''

یہ بات عجیب لگتی ہے لیکن اٹھارہویں صدی کے یورپ کا گہرا مطالعہ کرنے والے بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ اس زمانے کے بہت سے نوجوانوں میں فطرت کی طرف واپسی کا رجحان پیدا ہو رہا تھا۔ ''معاہدہ عمرانی'' نے اس رجحان کو گویا زبان عطا کر دی۔ اس کتاب کے جو حصے یا تصورات لوگوں کو اچھے نہ لگتے تھے ان کو نظر انداز کر دیا گیا۔ ان کے لئے زیادہ پرکشش حصے وہ تھے جن میں روسو نے انسان کی آزادی کا چرچا کیا تھا اور جتلایا تھا کہ فطرت نے انسان کو آزاد پیدا کیا تھا اور وہ اس کو آزاد ہی دیکھنا چاہتی ہے، لیکن غاصب حکمرانوں اور انسان دشمن سماجی نظاموں نے ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں ان کو غلام بنا ڈالا ہے۔

''معاہدہ عمرانی'' کی اشاعت سے فرانس میں ان خیالات کو تقویت ملی تو ان بیڑیوں کو کاٹ کر آزادی سے ہمکنار کے لئے ایک نیا ولولہ پیدا ہوا۔ 1789ء کا عظیم فرانسیسی انقلاب محض روسو کا مرہون منت نہ ہو، تب بھی روسو نے اس کے لئے ذہن تیار کرنے میں قابل قدر حصہ لیا۔ انقلابی دانشوروں اور رہنماؤں کو اس امر کا بھرپور احساس تھا۔ وہ روسو کو جلیل القدر استاد کا درجہ دیتے تھے۔

تعلیم وتربیت

مونٹ مورنسی کی وادی میں قیام کے دوران اپنا ناول مکمل کرنے کے بعد روسو بیک وقت دو کتابوں پر کام کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک یعنی ''معاہدہ عمرانی'' کا ذکر ہم گزشتہ دو ابواب میں کر چکے ہیں۔ دوسری کتاب ''ایمیل'' ہے، جس میں روسو نے اپنا نظام تعلیم پیش کیا ہے۔ اس شعبے میں وہ کئی امور میں نئی باتیں کہنے والا تھا۔ بعض نقادوں کا کہنا ہے کہ اس نے اپنی تخلیقی ذہانت کا بہترین اظہار ''ایمیل'' میں کیا۔ اس کتاب میں کئی ایسے تصورات موجود ہیں جن کو ہمارے زمانے کے علم تدریس میں اہم جانا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اپنے فکری نظام کی منطق کے حوالے سے روسو تعلیم کے موضوع پر قلم اٹھانے پر مجبور تھا۔ بات یہ ہے کہ اگر اس کے فکری نظام کا ایک بنیادی تصور یہ تھا کہ انسان اور اشیا اپنی اصلی حالت میں اچھی تھیں...... یعنی جس حالت میں ان کو فطرت نے پیدا کیا تھا...... اور یہ کہ تہذیب وتمدن کے تقاضوں نے ان کو بگاڑ دیا ہے، تو پھر لازمی طور پر اسے دنیا کو بتانا ہی تھا کہ تہذیب کاری کے اس خراب کرنے والے عمل کو کس طرح سے کم کیا جا سکتا ہے اور انسانوں کو کیونکر ان کی اصلی فطری حالت کے زیادہ سے زیادہ قریب رکھا جا سکتا ہے۔

تعلیم کے موضوع پر اپنی کتاب تحریر کر کے اس نے یہی فرض ادا کیا ہے۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ انسان کیا ہے اور اس کا کیا کچھ بنایا جا سکتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس کا زمانہ امید پرستی کا زمانہ تھا۔ زندگی میں نئی نئی تبدیلیاں آ رہی تھیں اور یورپ ایک عالمگیر کردار

ادا کرنے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ اس قسم کے عہد میں ہر کوئی یہ سوال پوچھا کرتا ہے کہ مستقبل کی بہتر صورت گری کس طرح ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں امید کے دور میں ہر کسی کو نوجوانوں میں معمول سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ اصل میں وہی مستقبل کے معمار ہوتے ہیں۔ یہ صورتحال تعلیم کے مسئلہ کی اہمیت کو بڑھا دیتی ہے۔ سماج کے رہنما، حکمران اور دانشور تعلیم پر زیادہ توجہ دینے لگتے ہیں اور اس پر غور وفکر شروع کر دیتے ہیں۔ روسو کے زمانے میں یہی کچھ ہو رہا تھا۔ فرانس کے کئی دانشور تعلیم کے موضوع پر بہت کچھ لکھ رہے تھے اور نئے نئے خیالات سامنے آ رہے تھے۔ تعلیم کے شعبے پر اہل مذہب کی اجارہ داری کے خلاف خاص طور پر ردعمل پیدا ہونے لگا تھا اور تعلیم کے سیکولر پہلو نمایاں کئے جانے لگے تھے۔

تعلیم کے موضوع پر روسو کے غور وفکر کے نتائج ''ایمیل'' کی صورت میں سامنے آئے۔ اس کا ضمنی عنوان ''تعلیم کے بارے میں'' ہے اور بلاشبہ یہ تعلیم و تدریس کے موضوع پر لکھی جانے والی سب سے زیادہ بااثر کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کے باوجود روسو کا معاملہ یہ تھا کہ وہ اس کتاب کو تعلیم کے موضوع پر مقالہ تسلیم کرنے سے انکار کرتا تھا۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ ''یہ اصول پر، جس کو مصنف نے اپنی دوسری تحریروں میں پیش کیا ہے، (یعنی یہ کہ انسان فطری طور پر نیک ہے۔) ایک فلسفیانہ کتاب ہے۔ اس اصول کو اس حقیقت سے ہم آہنگ کرنے کے لئے کہ انسان فاسق ہیں، انسان کی تاریخ کی تمام برائیوں کے منبع کو ظاہر کرنا ضروری تھا۔''

روسو نے یہ دعویٰ فلی برٹ کریمر کے نام ایک مکتوب میں کیا تھا جو 13 اکتوبر 1764ء کو لکھا گیا تھا۔ بعد ازاں اس نے یہ دعویٰ دہرایا بھی تھا۔ خیر، جہاں تک اس کی کتاب کا تعلق ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ دو مختلف سطحوں پر لکھی گئی ہے۔ ایک طرف وہ ''فطری انسان'' کے لئے موزوں ہونے والی تعلیم کو بیان کرتا ہے اور دوسر طرف انسان کی فطرت کا تجزیہ کرتا ہے۔ ان دونوں سطحوں پر وہ اس بنیادی تنقید سے آغاز کرتا ہے کہ اس کے زمانے کے فلسفی اور ماہرین تعلیم بچپن کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ وہ بالغوں کو الزام دیتا ہے کہ وہ اپنے سوا کسی اور کے ذہن کا تصور کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''بچوں کے دیکھنے، سوچنے اور محسوس کرنے کے اپنے انداز ہوتے ہیں لہٰذا اس سے زیادہ

احمقانہ کوئی اور بات نہیں کہ ان کے ذہن کو دبا کر ہم بالغ لوگ اپنی ذہنیت کو ان پر نافذ کر دیں۔'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ بچوں کی ایک خاص ذہنیت ہوتی ہے اور تعلیم کے شعبے میں پہلا کام اس ذہنیت کو سمجھنا ہے۔ روسو غالباً پہلا مفکر تھا جس نے تدریس کے علم کو بچے کا سائنسی انداز میں فہم حاصل کرنے سے منسلک کیا۔ اس حوالے سے اکثر اوقات آج بھی بچوں کی نفسیات کے علم کا بانی ہونے کا اعزاز دیا جاتا ہے۔ بہرحال اس معاملے میں ہم کو یاد رکھنا ہوگا کہ اس کا بچپن کا تصور نظری تھا اور وہ تجربی مشتملے سے محروم رہا۔ وجہ یہ ہے کہ اس نے یہ تصور کم و بیش مکمل طور پر بچپن کی کیفیت اور فطرت کی کیفیت کے درمیان ایک تمثیل سے اخذ کیا۔ اس کے نزدیک انسانی سماج میں بچہ ویسے ہی تنہا ہے جیسے گھنے جنگل میں کوئی وحشی انسان اکیلا ہوتا ہے۔ بچے کی اس فطری تنہائی کے حوالے سے وہ اس کی سماجی زندگی کے عمل میں قبل از وقت شرکت سے منع کرتا ہے۔ وہ ان والدین کی مذمت کرتا ہے جو وقت سے پہلے ہی بچے کو سماج کا حصہ اور کردار بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

''ایمیل'' میں روسو لکھتا ہے کہ فلسفی ''ہمیشہ انسان کو بچے میں تلاش کرتے ہیں اور اس امر پر دھیان نہیں دیتے کہ انسان ہونے سے پہلے وہ کیا ہوتا ہے۔'' وہ یہ بھی کہتا ہے کہ انسان فطرت سے جو تعلیم حاصل کرتا ہے............ یعنی ہماری قوتوں اور اعضاء کی داخلی نشو ونما............ وہ انسانی کنٹرول سے باہر ہے، لہٰذا انسانی تعلیم کا ہم آہنگ اور بااصول بیان نشو ونما کے فطری انداز پر مبنی ہونا چاہئے۔ یوں ہمارا مصنف بچے کی فطری نشو ونما کے مراحل کا تجزیہ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

ایمیل کو روسو نے اسی انداز سے ترتیب دیا ہے جس انداز سے وہ انسان کی فطری نشو ونما کو دیکھتا تھا۔ یہ کتاب پانچ حصوں میں تقسیم ہے اور وہ سب کے سب انسان کی زندگی کے مختلف مرحلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے حصے کا تعلق طفولیت سے، یعنی زندگی کے پہلے دو برسوں سے ہے جبکہ بچہ بولتا ہے، ٹھوس غذا کھاتا اور نہ ہی چل سکتا ہے۔ دوسرے حصے کا تعلق تین سے بارہ تیرہ سال کی عمر کے مرحلے سے ہے جبکہ بچہ ہوش سنبھالتا ہے، بولنے اور چلنے لگتا ہے، اپنے ماحول کا فہم حاصل کرتا ہے۔ کتاب کے تیسرے حصے میں غفوان شباب سے پہلے کے زمانہ، یعنی بارہ، تیرہ سے پندرہ برس کی عمر کا مرحلہ زیر بحث لایا گیا ہے۔ چوتھا حصہ غفوان شباب یعنی پندرہ سے بیس سال کی عمر سے متعلق ہے۔ پانچویں اور آخری حصہ

میں جوان اور بالغ فرد کے مسائل یعنی محبت، شادی اور بالغ ذمہ داری کی تعلیم کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ مرحلہ بیس سے تئیس چوبیس سال کی عمر کو محیط ہے۔

''ایمیل'' میں تعلیم کے اس جمہوری رجحان کا اولین اظہار ملتا ہے، جس کو بعد کے زمانے میں سیاسی اور بعض دوسرے عوامل نے براعظم یورپ اور مغربی دنیا کے دوسرے حصوں میں بتدریج عام کر دیا۔ یہ رجحان تعلیم کو ایسا عمل قرار دیتا ہے جس کا تعلق امرا اور خوش حال طبقات کے ساتھ ساتھ غریب اور محروم طبقوں سے بھی ہے۔ روسو سے پہلے اٹھارہویں صدی کے مفکر جب فرانس اور یورپ کے دوسرے حصوں میں بھی تعلیم کا پرچار کرتے تھے تو ان کے پیش نظر صرف امیر طبقوں کے نوجوانوں کی تعلیم ہوا کرتی تھی۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی یہی رجحان تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہم سرسید احمد خان کی مثال دے سکتے ہیں جو روسو کے سو سال بعد انیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم پر بہت زور دے رہے تھے۔ انہوں نے اس حوالے سے کئی عملی اقدامات بھی کیے۔ اس زمانے کے ہندوستان کے تعلیمی سیاسی اور سماجی امور میں اہم کردار ادا کرنے والے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لئے بنیادی کام انہوں ہی نے کیا تھا۔ تاہم صاف طور پر ان کی دلچسپی امرا اور خوش حال خاندانوں کے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت تک محدود تھی اور وہ عوام اور عورتوں کی تعلیم میں دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ عوام کے لئے بس یہی کافی سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنے حالات اور تجربات سے زندگی گزارنے کا کوئی نہ کوئی ڈھنگ سیکھ لیں گے۔

اٹھارہویں صدی کے وسط سے یورپ میں یہ تصور زوال کی زد میں آ گیا تھا۔ اس زمانے میں بالائی طبقوں کی سماجی اور سیاسی بالادستی کو بھی چیلنج کیا جانے لگا تھا۔ روسو نے فطری اور خود مکتفی فرد کی تیاری کو تعلیم کا نصب العین قرار دیا۔ اس نے سادہ اور فطرت کے تقاضوں کے مطابق تربیت کے لئے نوجوانوں کی لامحدود اہلیت کو بھی واضح کیا۔ لوگوں نے بجا طور پر اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس قسم کی اہلیت صرف امیروں کے بچوں تک محدود نہیں۔ یہ تمام انسانوں میں پائی جاتی ہے اور تمام لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

یوں ''ایمیل'' آنے والی تبدیلیوں پر اثر انداز ہوئی اور اس نے تعلیم کے شعبے میں تبدیلی کا عمل تیز کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایمیل کو ان چند کتب میں شمار کیا جاتا ہے جنہوں نے تعلیم و تربیت کے تصورات پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ اس کتاب میں ایسے خیالات

موجود ہیں جو اس زمانے کے غوروفکر کرنے والے اذہان کے لئے قابل قبول تھے۔ ایسے تصورات بھی ہیں جو مشکل ہی سے قبول کئے جا سکتے تھے۔ تاہم مجموعی طور پر اس نے فرانس اور اس کی حدود سے آگے بہت سے یورپی ذہنوں کو متاثر کیا۔

اس کتاب کے بنیادی موضوعات کا براہ راست تعلق مذہب سے نہیں ہے اور جہاں تک مصنف کا تعلق ہے، وہ والتیئر یا اپنے زمانے کے اکثر فلاسفہ کی طرح الحاد کی طرف مائل نہ تھا۔ بہرطور ''ایمیل'' کے ایک حصے میں اس نے مذہب کو موضوع بحث بنایا۔ یہ بات اس کے لئے جلد ہی مصیبت کا باعث بننے والی تھی۔ ہوا یہ کہ ''ایمیل'' کے منظر عام پر آتے ہی ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اس زمانے کے فرانس میں احتسابی ادارے بہت مضبوط تھے اور وہ کوئی نیا خیال پیدا نہ ہونے دیتے تھے۔ کیتھولک اداروں اور کلیسا کے عہدیداروں نے اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ وہ ان تمام کتابوں کو ضبط کر لیتے یا نذر آتش کر دیتے جن میں کوئی نیا خیال پیش کیا گیا ہو، مذہبی اداروں اور پادریوں پر تنقید کی گئی ہو یا پھر عام لوگوں کے ساتھ انصاف کرنے یا سیاسی اور معاشی اصلاحات نافذ کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہو۔ پیرس میں آئے دن کتابیں سرعام جلائی جاتی تھیں۔ لوگ یہ تماشا دیکھتے تھے کہ جاہل، اجڈ اور متشدد مذہبی عہدے دار کس قدر بے دردی اور بے نیازی سے عالم فاضل افراد کی برسوں کی محنت کو پل بھر میں راکھ کا ڈھیر بنا دیتے تھے۔ کتابیں جلانے کے ساتھ ساتھ ان کے مصنفین کو قید و بند کی سزائیں دی جاتی تھیں اور ان کا جینا دوبھر کر دیا جاتا تھا۔

مذہبی رہنماؤں نے خوف و ہراس کی فضا پیدا کر رکھی تھی۔ ان کی وجہ سے بہت سے مصنفین کتابوں پر اپنا نام درج کرنے سے گریز کرنے لگے تھے۔ کتابیں گمنام شائع ہو رہی تھیں۔ یہ گمنامی دانائی پر جہالت کے غلبے کی علامت تھی۔ اٹھارہویں صدی کے درمیانی عرصے کے فرانس میں سب سے زیادہ والتیئر کی کتابیں ضبط ہوئیں، جلائی گئیں اور ان کے حوالے سے مصنف پر مقدمے بھی چلائے گئے۔ آخر والتیئر نے تنگ آ کر کتابوں پر اپنا نام درج کرنا بند کر دیا۔ اس کے علاوہ وہ اشاعت کے مقامات کے نام بھی غلط دے دیتا تھا۔ اس کے باوجود خفیہ سرکاری ادارے والتیئر کی تحریریں ڈھونڈ لیتے تھے۔

روسو نے بچاؤ کے لئے دوسری راہ اختیار کی۔ چنانچہ ''ایمیل'' کی اشاعت سے پہلے اس نے سنسر شپ کے ادرے کے سربراہ سے اس کتاب کی اشاعت کی اجازت حاصل

کر لی۔ اس اجازت کے بعد یہ کتاب پیرس اور ایمسٹرڈیم سے کم و بیش ایک ہی وقت پر شائع ہوئی۔ مگر یہ احتیاط مصنف کے کام نہ آئی۔ مئی 1762ء میں کتاب کی اشاعت کے چند روز بعد 11 جون کو پیرس کی پارلیمنٹ نے اس کتاب کو نذر آتش کرنے اور مصنف کو گرفتار کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ گویا اٹھارہویں صدی کے فرانس میں ویسے ہی حالات تھے جیسے اکیسویں صدی میں ہمارے ہاں ہیں۔

پیرس کی پارلیمنٹ نے اپنے فیصلے کا جواز یہ دیا کہ روسو نے مذہبی عقائد کی نفی کی ہے اور یہ مشرکانہ عقیدہ پیش کیا ہے کہ انسان خدا پر یا مسیحت پر ایمان رکھے بغیر بھی نجات پا سکتا ہے۔ روسو کو سزا دینے کا مطالہ کرنے والوں میں پیرس کا آرچ بشپ بھی شامل تھا جس نے ''ایمیل'' پر کڑی نکتہ چینی کی اور اس کو سر عام جلانے پر زور دیا تھا۔ اس قسم کے الزامات فضول تھے۔ روسو والتیئر نہ تھا۔ وہ ایک مذہبی شخص تھا اور عمر بھر مذہبی رہا تھا۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ روسو کو سزا کا مطالبہ کرنے والوں نے کبھی اس امر کی وضاحت نہ کی کہ اس کی کتاب میں قابل اعتراض باتیں کہاں درج ہیں۔

اس موقع پر چند دوست روسو کے کام آ گئے۔ وہ پیرس سے باہر تھا اور ان دوستوں نے اس کو گرفتاری کے خطرے سے قبل از وقت آگاہ کر دیا۔ لیکن اس کو یقین نہ آتا تھا کہ فرانس میں ''خدا میں ایمان رکھنے والے اس واحد مصنف'' کو مسیحی عہدیدار نشانہ ستم بنانے پر تل گئے ہیں۔ روسو نے اپنی کیفیت بیان کی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ 8 جون 1762ء کا دن اس نے دو دوستوں کے ساتھ ہنسی خوشی گزارا۔ پھر رات ہوئی۔ ایام شباب سے اس کو رات کو مطالعہ کرنے کی عادت تھی۔ چنانچہ وہ پڑھتا رہتا۔ یہاں تک کہ آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگتیں۔ تب وہ چراغ گل کرتا اور سونے کے لئے لیٹ جاتا۔ رات کے وقت وہ عموماً بائبل کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ 8 جون کی رات معمول سے قدرے مختلف تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ لہٰذا وہ پڑھتا چلا گیا اور بائبل کا ایک پورا حصہ پڑھ ڈالا۔ کتاب نے اس کو بہت متاثر کیا۔ چنانچہ نیم خوابی کے عالم میں وہ پڑھے ہوئے حصے کے بارے میں دھندلے خواب دیکھ رہا تھا کہ اچانک روشنی اور شور نے اس کو بیدار کر دیا۔

اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ روسو کی دوست مادام دے لکسمبرگ کا ایک پیامبر مادام کا پیغام لے کر رات کے اندھیرے میں اس کے پاس آیا تھا۔ مادام کو پارلیمنٹ

کی طرف سے جاری ہونے والے حکم نامے کی اطلاع دو تین دن پہلے ہی مل گئی تھی۔ وہ پریشان ہوئی۔ اس نے پریشان ہونا ہی تھا۔ ''ایمیل'' کی تیاری میں مادام نے مصنف کی بہت مدد کی تھی۔ اس کو خیال آیا کہ روسو گرفتار ہوا، اس سے پوچھ گچھ ہوئی تو وہ مادام کی مدد کا قصہ بھی اگل دے گا۔ لہٰذا مادام نے روسو کو پیغام بھجوایا کہ وہ گرفتاری سے بچنے کے لئے بھاگ جائے۔

روسو پہلے ہی سہما ہوا تھا۔ پیغام ملتے ہی وہ تریزے کو وہیں چھوڑ کر نیو آتل کی طرف بھاگ نکلا۔ وہاں کے جرمن گورنر لارڈ مارشل نے اس کی حفاظت کی اور دوست بن گیا۔

اگلے باب میں ہم روسو کا پیچھا کریں گے۔

جلا وطنی کے دن

''ایمیل'' کی اشاعت سے اٹھنے والے طوفان سے جان بچا کر روسو بھاگا تو وہ 14 جون 1762ء کو برن کے علاقے میں پہنچا۔ بدقسمتی اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ وہ جنیوا میں پناہ لینا چاہتا تھا لیکن 19 جون کو جنیوا میں بھی حکام نے ''ایمیل'' اور ''معاہدہ عمرانی'' کی جلدوں کو نذر آتش کیا اور روسو کو گرفتار کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ برن کے حکام نے چند روز تحمل سے کام لیا اور آخر کار یکم جولائی کو ان کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔ انہوں نے روسو کو اپنے علاقے سے نکل جان کو کہہ دیا۔ روسو ایک بار پھر بھاگا اور 10 جولائی کو پروشیا کی ریاست نیوشیٹل پہنچا۔ چند ہی روز بعد 29 جولائی 1762ء کو اس کی پرانی مہربان مادام دے وارین اس دنیا سے رخصت ہونے والی تھی۔

نیوشیٹل فریڈرک اعظم کے ماتحت تھی اور روسو کی اس بادشاہ کے بارے میں رائے اچھی نہ تھی۔ اس کی دو شکایتیں تھیں۔ اول یہ کہ فریڈرک اعظم نے فرانسیسیوں کو شکست دی تھی، جن سے روسو کو محبت تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہمارے فلسفی کو فریڈرک اعظم کے اصول اور طرز عمل ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ وہ ان کو فطرت کے تقاضوں کے منافی سمجھتا تھا۔ ایک نظم میں اس نے لکھا تھا کہ فریڈرک فلسفی کی طرح سوچتا ہے اور بادشاہ کی طرح عمل کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں راہیں بہت مختلف ہیں۔ علاوہ ازیں روسو نے ''ایمیل'' میں بعض لوگوں کی رائے کے مطابق فریڈرک کا علامتی انداز میں ذکر کیا تھا، جو سراسر منفی تھا۔

خیر! روسو کا خیال تھا کہ سطحی جذبے کمزور لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ طاقتور

لوگ ان سے پاک ہوتے ہیں۔ چنانچہ فریڈرک اعظ کی سلطنت میں پہنچتے ہی اس نے علاقے کے گورنر لارڈ مارشل اورفریڈرک کو ایک خط لکھا۔ خط میں اس نے سلطنت میں اپنی آمد کی اطلاع دی اور یہ بھی لکھا کہ یہ جگہ اس کے لئے دنیا بھر میں واحد پناہ گاہ رہ گئی ہے، لہٰذا اس کو وہاں قیام کی اجازت دی جائے۔

فریڈرک کے نام خط میں اس نے لکھا کہ ''میں آپ کے خلاف بہت کچھ کہتا رہا ہوں اور شاید آئندہ بھی کہتا رہوں گا۔ پھر بھی فرانس، جنیوا اور برن کی ریاست سے نکالے جانے کے بعد میں پناہ کی تلاش میں آپ کی سلطنت میں آ نکلا ہوں............ جناب میں آپ کی طرف سے کسی عنایت کا مستحق نہیں، لیکن مجھ کو کسی مہربانی کی جستجو بھی نہیں، بس میں نے اپنا فرض سمجھا کہ عزت مآب کو مطلع کروں کہ میں آپ کے قبضہ قدرت میں ہوں اور آپ جو چاہیں میرے ساتھ سلوک کرتے ہیں۔''

فریڈرک اعظم فلسفیوں، شاعروں اور ادیبوں کا مداح اور سرپرست تھا۔ لیکن اس کو روسو اچھا لگتا تھا اور نہ ہی اس کی تحریریں۔ پھر بھی اس نے روسو کو قیام کی فوراً اجازت دے دی اور گورنر لارڈ مارشل کو یہ ہدایت بھی کی کہ اگر روسو قبول کرنے پر آمادہ ہو تو اس کو زندگی کی چھوٹی موٹی ضروریات مہیا کر دی جائیں۔ اس بادشاہ کا بجا طور پر موقف یہ تھا کہ اختلاف رائے کے باعث روسو کو تنگ کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ فریڈرک کی ہدایت کے مطابق جب گورنر نے امداد کی پیشکش کی تو روس نے مسترد کر دی۔ اس نے گورنر کو جواب دیا کہ ''جناب میرے پاس دو تین سال تک زندہ رہنے کے لئے وسائل موجود ہیں۔ میں آپ کے بادشاہ سلامت کی کوئی خدمت تو کرتا نہیں ہوں، اس لئے اگر بھوک سے مرنے لگوں تو بھی اس سے روٹی کا ایک لقمہ قبول کرنے کے بجائے گھاس کھانے کو ترجیح دوں گا۔''

چند ہفتے بعد روسو نے ایک خط میں فریڈرک اعظم کو لکھا۔ ''جناب آپ نے مجھ کو پناہ دی ہے۔ آپ میرے محسن ہیں۔ ممکن ہوا تو میں اس احسان کا بدلہ اتارنا چاہوں گا۔ لیکن آپ مجھ کو روٹی بھی دینا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کی رعایا میں کوئی نہیں جس کو اس کی حاجت ہو۔''

روسو غریب تھا۔ غریب الوطن تھا۔ مصائب میں گھرا ہوا تھا۔ ان باتوں کے باوجود اس کی طرف سے خودداری کا یہ اظہار نہایت قابل تعریف ہے اور ان شاعروں اور

ادیبوں کے لئے مثال بھی ہے جو بادشاہوں اور امیروں کی چوکھٹ پر پڑے رہتے ہیں۔

خیر! نیوشیٹل میں روسو کو زیادہ سازگار ماحول میسر نہ تھا۔ مگر وہ وہیں رہنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اس کو جنیوا پر ناز تھا لیکن اس شہر کے حکام نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا تھا۔ چنانچہ 12 مئی 1763ء کو اس نے اپنے اس محبوب شہر کی شہریت باقاعدہ طور پر تیاگ دی۔ اسی اثنا میں تریزے روسو کے پاس پہنچ گئی۔ مگر اس کو یہ جائے پناہ اچھی نہ لگی۔ خاص طور پر وہ وہاں کی تنہائی سے بیزار ہوگئی۔ بات یہ تھی کہ اس شہر میں کوئی اس کی زبان نہ سمجھتا تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ شہر کے لوگوں کو خبر ہوگئی کہ تریزے روسو کی باقاعدہ بیوی نہیں ہے۔ وہ نکاح کے بغیر اکٹھے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کے آداب اس انداز کے رہن سہن کو پسند نہ کرتے تھے۔ لہٰذا وہ ان دونوں سے کھچے کھچے سے رہنے لگے۔ دوسری طرف ان دونوں نے شہر کے لوگوں کے اس رویے سے یہ تاثر دیا کہ وہ ان کو نقصان پہنچانے کی سازش کر رہے ہیں۔

ایک رات ہجوم نے ان کے گھر پر پتھر پھینکے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ لوگوں نے واقعی یہ حرکت کی تھی یا تریزے کو اس کا وہم ہوا تھا اور اس نے روسو کو یقین دلایا تھا کہ ان کے گھر پر حملہ کیا گیا ہے۔ بہرطور روسو کا دعویٰ یہ رہا کہ ان کے گھر پر واقعی حملہ ہوا تھا اور لوگوں نے کھڑکیوں کے ذریعے گھر کے اندر پتھر پھینکے تھے۔

حملہ ہوا تھا یا نہیں۔ ایک بات البتہ طے کہ روسو کے لئے وہ پریشانی کے دن تھے۔ 1765ء میں وہ تریزے کو ساتھ لے کر نیوشیٹل سے نکلا اور سین پیرلے کے چھوٹے سے خوبصورت جزیرے کی طرف روانہ ہوا اور چند ہفتے وہاں رہا۔ ان ایام میں وہ نباتاتی امور میں دلچسپی لینے لگا تھا اور اس کے ذہن میں یہ خیال سمایا کہ وہ ویسے ہی جنگلی زندگی گزار رہا تھا جیسے فطری زندگی ہوا کرتی تھی۔ اس جزیرے پر اس کو مادام دی بوفلرز کے ذریعے اٹھارہویں صدی کے ممتاز انگریز فلسفی ڈیوڈ ہیوم کا پیغام ملا۔ ہیوم نے اس کو انگلستان آنے کی دعوت دی تھی۔ روسو ابھی اس دعوت کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دسمبر 1756ء میں اس کو پیرس آنے کی غیر رسمی اجازت مل گئی۔ 16 دسمبر کو وہ پیرس پہنچا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس نامہربان شہر میں وہ زیادہ دنوں تک امن و چین سے نہ رہ سکے گا۔

اس کو ہیوم کی دعوت کا خیال آنے لگا۔ اصل میں لارڈ مارشل نے ہیوم کو روسو کو

پریشانیوں کے بارے میں بتایا تھا اور کہا تھا کہ پورے یورپ میں اس کے لئے حالات خراب ہو چکے ہیں۔ اس پر ہیوم نے اس کی مدد کرنے اور انگلستان میں اس کے لئے پناہ ڈھونڈنے کی پیشکش کی تھی۔ اس کے بعد روسو اور ہیوم میں خط و کتابت بھی ہوئی۔

روسو جب پیرس میں تھا تو ہیوم لندن سے وہاں آیا۔ اس نے دیکھا کہ اگر چہ یورپ کی کئی حکومتیں روسو کی مخالف ہو چکی ہیں، لیکن اس کی شہرت آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ یہاں تک کہ عظیم الشان والتیئر بھی اس کے سامنے دھندلا گیا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ روسو کے ساتھ ساتھ تریزے اور ان کے کتے کا نام بھی یورپ میں گونجر ہا تھا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ہمارا فلسفی اس شہرت کا دیوانہ تھا۔ یہ اس کو برسوں کی تگ و دو کے بعد ملی تھی۔ یہ بات درست ہو سکتی ہے لیکن ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ اس ماحول سے نکلنے کے لئے بے تاب تھا۔

اس نے انگلستان جانے کا ارادہ کر لیا۔

1766ء کے پہلے ہفتے میں وہ ہیوم کے ساتھ فرانس سے نکلا اور بارہ گھنٹے کے سمندری سفر کے بعد انگلستان کی بندرگاہ ڈوور جا پہنچا۔ اس روز ہیوم بیمار تھا مگر روسو نے یہ سفر ہنسی خوشی طے کیا۔ 13 جنوری کو وہ دونوں لندن پہنچے۔ روسو وہاں پہلی بار آیا تھا۔ شہر کے لوگوں نے خوشی سے استقبال کیا۔ وہ اس کو ہاتھوں ہاتھ لے رہے تھے۔

وہ بادشاہ جارج سوم کا زمانہ تھا۔ بادشاہ جواں سال تھا اور اس کو اپنے دارالحکومت میں یورپ کے مشہور فلسفی کی آمد پر بہت خوشی ہوئی۔ اس نے فوراً ہی روسو کو پناہ دینے کا فرمان جاری کیا۔ برک نامی جس مدبر نے اٹھارہویں صدی کی انگریزی سیاست میں بڑا نام پیدا کیا، وہ انہی دنوں پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا تھا۔ وہ کم و بیش روزانہ ہی روسو سے ملنے آ نکلتا تھا۔ وہ روسو کا مداح تھا لیکن جلد ہی اس سے بیزار ہونے والا تھا۔

ہیوم خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ اس نے ایک بدنصیب غیر ملکی جینئس کی مدد کی تھی جس پر زمانہ تنگ ہو رہا تھا۔ ایک دوست کو اس نے خط میں لکھا کہ ''میں روسو سے بہت محبت کرتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہ بھی میرے بارے میں ایسے ہی احساسات رکھتا ہے۔ میں نے زندگی میں اس قدر منکسر المزاج، حلیم الطبع، نرم خو، شائستہ اور گرم جوش شخص نہیں دیکھا۔ دیکھنے میں بھی وہ دوست دار نظر آتا ہے۔ مجھے کبھی ایسے شخص سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا جو اچھی رفاقت کے لئے اس سے زیادہ موزوں ہو۔''

ایک اور خط میں ہیوم نے لکھا کہ لوگوں نے اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا کر دیئے تھے۔ ''وہ کہتے تھے کہ جھگڑے کے بغیر تم ایک دن بھی نہ رہ پاؤ گے لیکن میں تو سمجھتا ہوں کہ پوری زندگی اس کے ساتھ دوستی اور احترام کے رشتے میں بسر کر سکتا ہوں۔ میرے نزدیک ہمارے باہمی اخلاص کی بنیاد یہ ہے کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی جھگڑالو نہیں ہے۔''

چند ہی ہفتوں بعد دنیا دیکھنے والی تھی کہ کائنات کی گتھیاں سلجھانے والے فلسفی روز مرہ زندگی میں کس قدر سادہ لوح ہو سکتے ہیں اور ان کے اندازے کس قدر سطحی ہوتے ہیں۔ ہیوم اور روسو میں ایک ایسا جھگڑا شروع ہونے والا تھا جس کی بہت دھوم ہوئی۔ اس پر بہت سے پمفلٹ لکھے گئے اور آج تک اس کے چرچے ہوتے ہیں۔ مانا کہ مشہور لوگوں کے جھگڑے بھی مشہور ہو جاتے ہیں۔ مگر ان دونوں کے جھگڑے نے زیادہ ہی شہرت پائی ہے۔

لندن میں دوستانہ استقبال کے باوجود روسو پہلے دن ہی اس شہر سے بیزار ہو گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ گپ بازی اور رنگ رلیوں میں یہ شہر یورپ کے دوسرے دارالحکومتوں سے مختلف نہیں ہے۔ ہیوم نے اس کے لئے سٹارفورڈ شائر میں ووٹون کے مقام پر ڈیون پورٹ نامی ایک شخص کے گھر میں قیام کا بندوبست کیا تھا۔ ڈیون پورٹ ایک امیر آدمی تھا اور اس کا یہ امکان عرصے سے خالی پڑا تھا۔ وہ فرانسیسی فلسفی سے کرایہ وصول کرنے پر آمادہ نہ تھا، لیکن روسو نہ مانا۔ آخر کار تیس پونڈ سالانہ کرایہ طے پایا۔

یہاں بھی ماحول روسو اور اس کی رفیقہ حیات کے لئے سازگار نہ تھا۔ وہ اہل شہر کی اور شہر والے ان کی زبان نہ سمجھتے تھے۔ روسو سے ملنے کے لئے لوگ آ جاتے تھے لیکن تریزے کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ اس کی بس ایک ہی مصروفیت تھی۔ جب موسم اچھا ہوتا تو وہ دونوں لمبی سیر کے لئے نکل جاتے۔

یہ تنہائی اداسی اور پریشانی کے دن تھے۔

روسو کا ذہنی دباؤ بڑھ رہا تھا۔ وہ نفسیاتی توازن سے محروم ہو رہا تھا۔ مختلف وسوسوں اور دور دراز کے اندیشوں نے اس کو گھیر لیا تھا۔ اس وہم کی شدت بڑھتی جا رہی تھی کہ ہر کوئی اس کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ زیادہ شبہ اس کو دوستوں پر تھا۔ اپنے طور پر اس کو یقین ہو گیا تھا کہ ہیوم بظاہر دوست سہی لیکن وہ درپردہ تین کے اس ٹولے کا رکن ہے جو اس

کے خلاف سازشیں کر رہا ہے۔ اچھا دوسرے دو کون تھے؟ وہ والٹیئر اور دو آملبیر تھے۔

روسو اور ہیوم دونوں کے سوانح نگاروں نے ان اسباب کا ذکر کیا ہے جن کی بنا پر روسو کے شبہات کو تقویت ملی ہے۔ جان مورلے نے جن اسباب کا ذرکیا ہے، ان میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہے:

1۔ روسو جب پیرس میں تھا تو اس کو ایک خط موصول ہوا جو بظاہر پروشیا کے بادشاہ فریڈرک اعظم کی طرف سے تھا، جو والٹیئر کے دوستوں اور سرپرستوں میں شمار ہوتا تھا۔ مگر یہ خط اس قدر بے ہودہ قسم کے طنزیہ انداز میں لکھا گیا تھا کہ روسو کو یہ یقین کرنے میں دیر نہ لگی کہ یہ کسی بادشاہ کا خط نہیں ہے۔ اس کو گمان ہوا کہ یہ جعلی خط والٹیئر نے لکھا ہے۔ بعد میں اس کو آملبیر پر شبہ ہوا۔ اصل میں یہ خط ہوریس وال پول نے لکھا تھا جو ان دنوں پیرس میں تھا۔ اس خط نے لوگوں کو روسو پر ہنسنے کا بہانہ دے دیا۔ ہوریس وال پول ہیوم کا دوست تھا اور ہیوم لوگوں کو یہ بھی بتاتا پھرتا تھا کہ وہ خط جعلی ہے۔ اس سے روسو نے یہ سمجھا کہ یہ لوگ مل کر اس کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔

2۔ لندن میں ہیوم جنیوا کے سرجن ٹرونچن کے بیٹے کے ساتھ رہتا تھا۔ روسو کو اپنا جانی دشمن سمجھتا تھا۔

3۔ ہیوم میں ایک بری عادت تھی۔ وہ روسو کے خط چوری چھپے کھول کر پڑھ لیا کرتا تھا۔ خطوط حاصل کرنے کے لئے وہ کئی فریب کرتا تھا۔ یوں وہ روسو کی نظروں میں مشکوک ہو گیا۔

4۔ انگلستان کے بعض اخباروں میں روسو کے خلاف ایک طنزیہ خط شائع ہوا۔ اس میں بعض ایسی باتیں شامل تھیں جو صرف ہیوم کے علم میں تھیں۔

ایک بار روسو نے یہ گلہ بھی کیا کہ ہیوم نے اپنی ایک تصویر بنائی جس میں وہ کسی آسمانی مخلوق جیسا خوبصورت نظر آتا تھا۔ اس نے روسو کی بھی تصویر بنوائی تھی۔ لیکن اس کو اتنا بدصورت دکھایا گیا تھا جیسے وہ کوئی ریچھ ہو۔

اچھا جھگڑے کے اسباب اگر یہ ہیں تو ماننا ہوگا کہ ہیوم زیادہ ذمہ دار ہے، لیکن وہ چالاک اور ہوشیار تھا۔ روسو سادہ دل تھا اور مصائب میں پھنسا ہوا بھی تھا۔ اس نے جانا

کہ دوستوں کے روپ میں دشمنوں نے اس کو قابو کر لیا ہے۔ یوں اس کی نفسیاتی حالت بگڑنے لگی۔ جسمانی صحت بھی اب زیادہ ہی خراب رہنے لگی۔ وہ اس اندیشے میں مبتلا تھا کہ دشمن اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ جہاں وہ جاتا ہے دشمن اس کو نقصان پہنچانے کی خاطر پہلے ہی وہاں پہنچ جاتے ہیں۔

ذہنی الجھنوں اور اندیشوں نے روسو کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ اس کی یہ حالت پوشیدہ نہ رہی۔ بالکل غیر متعلقہ معاملات بھی اب اس کو دشمنوں کی سازش کے ثبوت نظر آنے لگے۔ وہ یہاں تک سوچنے لگا کہ انگلستان کی حکومت بھی اس کے خلاف سازش میں شریک ہو چکی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سازش کے "سرغنہ" ہیوم سے الجھ پڑا۔

خیر! دونوں کی اس لڑائی پر ہم کو زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہماری دلچسپی کی بات یہ ہے کہ جب روسو کے دل میں ہیوم کے خلاف طوفان اٹھنے لگا تو خود اس انگریز فلسفی اور روسو کے میزبان نے بھی صبر و تحمل اور مناسب شائستگی سے کام نہ لیا، وہ غصے سے پھٹ پڑا۔ شاید اس کو یہ گھمنڈ زیادہ ہی تھا کہ اس نے روسو پر احسان کئے ہیں۔

اس نے اپنے فرانسیسی مہمان کے خلاف مہم شروع کر دی۔ اس نے اپنے تمام دوستوں کو خط لکھے جن میں روس کے بارے میں ناگوار باتیں درج تھیں۔ یہ وہی دوست تھے جن کو ہیوم چند ہفتے پہلے روسو کی تعریفوں سے بھرے ہوئے خطوط بھیج چکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے انگلستان اور فرانس دونوں ملکوں میں پمفلٹ بھی چھپوائے جن میں جھگڑے کی ساری ذمہ داری روسو پر ڈالی گئی تھی اور ہیوم نے خود کو بے گناہ ثابت کیا تھا۔ اس اچھے بھلے فلسفی کو یہ خیال نہ آیا کہ دو دوستوں کے اس جھگڑے کو سر عام اچھالنا اچھا نہیں۔ کئی سال بعد روسو نے اس بات کا شکوہ بھی کیا تھا۔

انگلستان روسو کے لئے مہربان ثابت نہ ہوا۔ بہرحال جب بادشاہ جارج سوم نے 18 مارچ 1767ء کو اس کا سو پونڈ سالانہ وظیفہ مقرر کیا تو اس نے قبول کر لیا۔ البتہ یہ چھان بین ضرور کی کہ اس شاہی مہربانی کے پیچھے ہیوم کا ہاتھ تو نہیں۔ وہ اپنے اس کرم فرما کا کوئی اور احسان لینے پر تیار نہ تھا۔

ذہنی کیفیت اور سماجی ماحول کے ساتھ ساتھ موسم بھی شدید ہو رہا تھا جب کبھی موسم خوشگوار ہوتا وہ سیر کے لئے نکل جاتا۔ نئے پودے تلاش کرنے کا جنون اب تک اس کے سر

پر سوار تھا۔ ایک بار اس نے دعویٰ کیا کہ کسی نئے پودے کی دریافت تمام انسانوں کو نصف صدی تک اپنے خطبے سنانے سے زیادہ مفید ہے۔ وہ گھر کے نواحی علاقے کے درختوں اور پودوں کا مطالعہ کرتا اور چٹانوں کی سیر کرتا۔

یہ سیریں جلد ختم ہو گئیں۔ سرما کے دن آ گئے۔ برفباری نے اس چار دیواری میں بند رہنے پر مجبور کر دیا۔ کام کاج کے لئے آنے والی عورتوں کے ساتھ تریزے کے جھگڑے بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ زچ ہو گیا۔ گھر میں بند رہنے سے ذہنی الجھنیں بڑھ گئیں۔ اس کو لگا کہ پوری انگریز قوم اس کے خلاف سازش میں جت گئی ہے اور یہ کہ اس کے سارے خطوط کھول کر پڑھ لئے جاتے ہیں، اس کی حرکات پر نظر رکھی جاتی ہے، دشمنوں نے اس کام کے لئے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں، انہوں نے چاروں طرف گارڈ بھی چھپا رکھے ہیں تاکہ وہ بچ کر نہ نکل سکے۔

ذہنی دباؤ جب حد تے بڑھ گیا تو وہ خوف اور وسوسوں کے شدید دورے کی حالت میں سب کچھ چھوڑ کر ووٹون سے بھاگ گیا۔ دس پندرہ دنوں تک اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ آخر کار ڈیون پورٹ کو لنکن شائر سے اس کا ایک خط موصول ہوا، جو شکوؤں اور دکھوں سے بھرا ہوا تھا۔ ڈیون پورٹ نے بدقسمت روسو کو لانے کے لئے فوراً ایک ملازم روانہ کیا۔ مگر روسو ایک بار پھر غائب ہو گیا۔

18 مئی 1767ء کو وہ ڈور میں تھا۔ وہاں سے اس نے سیکرٹری آف سٹیٹ جنرل کانوائے کو ایک خط لکھا جس میں اپنے تمام خدشے درج کر دیئے۔ اس نے لکھا کہ سازی دشمنوں نے اس کو گھیر لیا ہے اور وہ سب اس کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ سازی اس کو انگلستان جانے نہ دیں گے کیونکہ ان کا خوف ہے کہ اس کے باہر جانے سے ان کی کمینگیوں کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ روسو نے جنرل کانوائے کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے اس کو لالچ بھی دیا۔ اس نے لکھا کہ اگر جنرل اس کو وطن واپس جانے کی اجازت دے دے تو وہ وعدہ کرتا ہے کہ اس نے جو یادداشتیں لکھی ہیں، ان کا ایک لفظ بھی شائع نہ کروائے گا اور نہ ہی انگلستان میں اس پر گزرنے والی بپتا کا کسی سے ذکر کرے گا۔

یہ خط 20 یا 22 مئی 1767ء کو لکھا گیا تھا۔ اسی رات وہ کسی طور کشتی پر سوار ہو کر فرانس چلا گیا۔

آخری سال

لگتا ہے کہ واپسی کا اثر اچھا ہوا۔ روسو کے حواس بحال ہونے لگے۔ دل وہموں سے خالی نہ ہوا، لیکن اس کو یہ مثبت احساس بھی ہونے لگا تھا کہ حکام اور دوسرے لوگوں کو اس کی واپسی سے خوشی ہوئی ہے اور یہ کہ انہوں نے عزت و احترام کے ساتھ اس کا استقبال کیا ہے۔

روسو نے انگلستان میں دس ماہ گزارے تھے۔ وہ اس کے لئے اچھے دن نہ تھے۔ ذہنی سکون اور نیند دونوں سے وہ محروم ہو چکا تھا۔ اس کیفیت میں اس نے اپنے حالات زندگی لکھنے شروع کئے۔ شاید اس طریقے سے وہ اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ یا یوں کہئے کہ وہ اپنا موقف دنیا کے سامنے پیش کرنے کا آرزومند تھا۔ اس کتاب میں ہم نے جا بجا روسو کی خودنوشت ''اعترافات'' کا حوالہ دیا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ روسو کو سمجھنے کے لئے بہترین کتاب یہی ہے۔

فرانس واپس آنے پر کئی مصائب باقی تھے۔ ''ایمیل'' کی اشاعت کے بعد پیرس کی پارلیمنٹ نے اس کی گرفتاری کا جو حکم جاری کیا تھا، وہ جوں کا توں تھا اور اس کو کسی وقت بھی گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ روسو کو پناہ کی تلاش تھی اور وہ چھپ رہا تھا۔ ان حالات میں ایک پرانا دوست پرنس آف کونٹی کام آیا۔ اس نے ہمارے فلسفی کو ٹائر کے مقام پر اپنی دیہی حویلی میں رہنے کے لئے جگہ دے دی۔ وہیں اس نے ''اعترافات'' کا دوسرا حصہ مکمل کیا۔ مگر انہی دنوں اس کی ذہنی حالت جو ابھی پوری طرح ٹھیک نہ ہوئی تھی، ایک بار پھر بگڑنے لگی۔ اس

کے دل میں یہ وہم پیدا ہو گیا کہ اس کے ہمسائے، ملازم اور یہاں تک کہ مالی بھی اس کے خلاف سازش میں ہیوم کے ساتھ مل گئے ہیں اور دن رات اس کا پیچھا کرتے ہیں اور اس کی جاسوسی کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ حالت زیادہ خراب ہونے لگی۔ یہاں تک کہ لکھنے پڑھنے کا کام بھی ختم ہو گیا۔ اب وہ چند خطوط لکھتا اور کہتا کہ یہ بھی مشکل کام ہے۔

نباتات میں اس کی دلچسپی البتہ قائم تھی۔ وہ نئے پودوں کی تلاش میں نکلتا اور اس عام میں اس کی کیفیت کسی بچے جیسے ہوتی جو اپنے کھیل سے خوشی حاصل کر رہا ہو لیکن آخر کار وہی ہوا جو پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔ 56 سالہ روسو ٹائر ویسے ہی بھاگ نکلا جیسے ووٹون سے بھاگا تھا۔ بظاہر وہ چیمبری جانے کیلئے روانہ ہوا جہاں کی پرانی یادیں اس کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں، لیکن گرے نوبل کے مقام پر وہ ایک الجھن میں پھنس گیا۔ وہاں کے ایک شخص نے دعویٰ کر دیا کہ اس نے چند سال پہلے روسو کو چند فرانک قرض کے طور پر دیئے تھے۔ وہ اپنی رقم واپس مانگتا تھا۔ بلاشبہ وہ جھوٹا تھا اور آخر کار اس کو اپنے دعٰوے سے دست بردار بھی ہونا پڑا۔ مگر اس سے معاملہ رفع دفع نہ ہوا بلکہ روسو کو اس امر کا ایک اور ثبوت مل گیا کہ سب لوگ اس کے خلاف سازش میں شریک ہیں اور اس کو ذلیل وخوار اور تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

روسو گرے نوبل سے نکلا اور بوگن پہنچا۔ بوگن میں اس پر خودنمائی کا جذبہ حاوی ہونے لگا۔ چنانچہ اس نے اپنے بیڈ روم کے دروازے پر ایسے جملے لکھوائے جو یہ ظاہر کرتے تھے کہ دنیا بھر کے سر پر اس کا بھوت سوار ہے اور یہ کہ ساری دنیا کے بادشاہ بشپ اور امرا بھی اس کے دشمن ہو گئے ہیں۔

بوگن سے نکلنے کے بعد روسو مختلف مقامات پر گھومتا رہا۔ اس کے پاؤں میں چکر تھا، کہیں اس کو چین نہ آتا۔ اس کی خانگی زندگی کا سکون بھی ختم ہو رہا تھا۔ تریزے کے ساتھ تعلقات اچھے نہ رہے تھے۔ یوں اس کے مصائب بڑھ گئے۔ سکون کی تلاش میں اس نے بحرالکاہل کے پرا مغربی علاقے کی طرف جانے کا ارادہ کر لیا۔ مگر یہ بس ادھورا ارادہ ہی تھا، وہ مسلسل غیر یقینی کیفیت میں مبتلا تھا۔ یہاڈں تک کہ ایک بار اس نے دوبارہ انگلستان جانے کے بارے میں سوچا۔ اصل میں یہ سارے ارادے بیمار اور منتشر ذہن رکھنے والے شخص کے پریشان خواب تھے۔ پیرس کی یاد اس کو ستانے لگی۔ شاید اس کو احساس ہونے لگا تھا کہ اس

کے قدردان زیادہ تر اسی شہر میں ہیں۔ چنانچہ وہ پیرس آ گیا اور آنے والے سات برسوں تک اس شہر میں رہنے والا تھا۔ یہ جولائی 1770ء کا واقعہ ہے۔ پیرس کے بعض حلقوں میں اس نے اپنی سوانح عمری ''اعترافات'' کے بعض حصے پڑھ کر سنائے تو ایک سنسنی سی پیدا ہو گئی۔ بعض لوگ ناراض ہو گئے اور بعض ڈر گئے کہ روسو اس کتاب میں ان کے کئی راز کھول دے گا۔ ان دنوں دیکھنے میں اس کے رویوں میں قدرے اعتدال پیدا ہو گیا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ اس کا برتاؤ پہلے جیسا مردم بیزار نہ رہا۔ مگر یہ تبدیلیاں ظاہری تھیں۔ اس کی باطنی زندگی بدستور اضطراب اور انتشار کی زد میں تھی۔ اس کے خدشے اور وسوسے کم نہ ہوئے تھے۔

اس زمانے کے یورپ میں ہر جگہ روسو کی شہرت پھیلی ہوئی تھی۔ بحرالاہل کے پار امریکہ میں بھی اس کی کتابیں پڑھی جا رہی تھیں۔ امریکی نوجوان اور مدبر ان کتابوں سے متاثر ہو رہے تھے۔ ہر جگہ اس کو اعلیٰ درجے کا فلسفی، ادیب اور مدبر مانا جا رہا تھا۔ وہ پیرس میں تھا تو پولینڈ میں مختلف گروہوں کے درمیان تصادم نے شدت اختیار کر لی تھی۔ خانہ جنگی پر قابو پانے کی غرض سے پولینڈ کے حکمرانوں نے میبلی سے تجاویز مانگیں۔ اس نے مختلف تجاویز مرتب کر کے بھیج دیں لیکن لگتا ہے کہ حکمرانوں کو اس کی تجاویز پسند نہ آئی تھیں۔ چنانچہ 1771ء میں انہوں نے روسو سے رابطہ کیا اور اس سے بھی یہی درخواست کی۔ جواب میں اس نے ''پولینڈ کی حکومت پر غوروفکر'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا۔ اس نے حکمرانوں کو اشراہ دیا کہ ہمسایہ ملک ان کے بعض علاقوں پر نظریں جمائے ہوئے ہیں اور ان پر قبضہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ جو ملک علاقے چھینیں گے ان کے حق میں اچھا نہ ہو گا۔ البتہ بعض علاقوں سے محروم ہو کر خود پول قوم کو فائدہ پہنچے گا کیونکہ ملک میں قومی ہم آہنگی اور وحدت پیدا کرنے میں آسانی ہو گی۔ اس نے پولینڈ میں فیڈریشن کے قیام کی تجویز دی۔ روسو کی ایک پیش گوئی جلد ہی اس وقت پوری ہو گئی جب پولینڈ کی پہلی تقسیم عمل میں آئی۔

اس تحریر کے بعد اس نے ''مکالمات'' پر کام شروع کیا جو اس کی سوانح عمری کا حصہ بنے۔ ''مکالمات'' کے مطالعہ سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا مصنف شدید قسم کی ذہنی ابتلاؤں سے گزر رہا تھا۔ وہ تنہائی کا شکار بھی تھا۔ کم و بیش سبھی پرانے دوستوں سے اس

کے رابطے ٹوٹ چکے تھے اور لوگ اس کے شکی مزاج اور جھگڑالو پن کے سبب اس سے دور رہنے لگے تھے۔

تنہائی اور پریشانی کے ان برسوں میں روسو نے لمبی لمبی سیریں جاری رکھی تھیں۔ پیرس میں وہ صبح سویرے اٹھتا۔ موسیقی کے مسودے تیار کرتا جو اس کے لئے روزی کمانے کا وسیلہ تھے۔ اسکے بعد وہ نئے حاصل ہونے والے پودوں کا مطالعہ کرتا۔ دوپہر کے وقت وہ کافی پینے کی غرض سے بازار جاتا اور پھر سیر کو نکل جاتا۔ وہ رات کو واپس آتا اور ساڑھے دس بجے بستر پر لیٹ جاتا۔ دوسرے روز یہی معمولات شروع ہو جاتے۔

مضافاتی علاقے اس کو ہمیشہ سے پسند تھے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ''جو کافر اور ملحد ہیں ان کو دیہی علاقے راس نہیں آتے۔ وہ پیرس کے شیدائی ہیں جہاں دولت کی ریل پیل ہے اور شہری سہولتیں میسر ہیں............ اچھے کھانے، کتابیں اور دلربا عورتیں............ لیکن یہ چیزیں مناظر کے ساتھ ساتھ پرندے بھی اس کے دل کو بھاتے تھے۔ ان کے نغمے اس کے لئے جانفزا تھے۔ ایک قصہ یوں ہے کہ دو ابابیلوں نے اس کے بیڈ روم میں گھونسلہ بنا لیا۔ وہ لکھتا ہے کہ ''میں ابابیلوں کا محافظ بن کر رہ گیا ہوں۔ ہر وقت ان کے لئے کھڑکی کھلی رکھتا ہوں تا کہ ان کی آمد و رفت میں کوئی رکاوٹ نہ آئے۔''

یہ اس کی زندگی کے آخری سال تھے اور ان دنوں میں غربت نے اس کے گھر میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ یہ مفلسی کسی حد تک خود اختیاری بھی تھی۔ انگلستان کے بادشاہ جارج سوم نے اس کے لئے جو وظیفہ مقرر کیا تھا، وہ اس نے بس ایک سال ہی وصول کیا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ وہ اس مالی سہولت سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتا تھا۔ خیر، وظیفہ کی رقم جمع ہوتی رہی۔ جب وہ چھ سات ہزار فرانک کے لگ بھگ ہو گئی تو اس کے حالات سے متاثر ہو کر ایک دوست نے رقم کی ادائیگی کے لئے رقم کی ڈرافٹ جاری کر دیا۔ روسو کو جب صورتحال کا علم ہوا تو وہ دوست سے بگڑا اور اپنے معاملات میں دخل دینے سے روکا۔ اس نے رقم کا ڈرافٹ بھی ضائع کر دیا۔ اس موقع پر بعض دوسرے دوستوں نے بھی اس کو وظیفہ کی رقم قبول کر لینے کا مشورہ دیا، مگر وہ نہ مانا۔

1777ء کے زمانے میں غربت رنگ دکھانے لگی۔ روسو کی صحت بگڑ چکی تھی اور وہ کام کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ تریزے کی جسمانی توانائیاں بھی پہلے سی نہ رہی تھیں۔ وہ

اچھی طرح گھر کی دیکھ بھال نہ کرسکتی تھی۔ علاوہ ازیں دونوں کے تعلقات بھی زیادہ خوش گوار نہ تھے۔ انہی دنوں بہت سے لوگوں کو روسو نے اس مضمون کا خط بھیجا کہ وہ اور اس کی اہلیہ ناگفتہ بہ حالات میں زندگی گزار رہے ہیں اور اب دونوں کے لئے کسی محتاج خانے میں پناہ لینے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا۔ اس نے دوستوں اور واقف کاروں سے التجا کی کہ اس کو اور تریزے کو کسی غریب خانے میں جگہ دلوا دی جائے جہاں وہ زندگی کے باقی دن گزار سکیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ اس خط کے بعد کئی لوگوں نے روسو کی مدد کرنی چاہی وہ مگر انکار کرتا رہا۔ آخر کار مارکوئس دی گرار دن نیاس کو پیرس سے تقریباً بیس میل دور ارمنو ویل کے قصبے میں رہنے پر آمادہ کر لیا۔

20 مئی 1778ء کو روسو وہاں منتقل ہو گیا۔

قدرتی ماحول میسر آنے پر قصبے میں اس کا جی لگ گیا۔ لہٰذا اس کی ذہنی کیفیت قدرے بہتر ہونے لگی۔ کی لوگ وہاں اس کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ دوسری طرف پیرس کے لوگوں نے جانا کہ روسو نے مدد کے لئے جو خطوط لکھے وہ محض بہانہ تھا۔ اصل میں وہ دوسروں کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتا تھا اور شاید اس کی خواہش یہ بھی تھی کہ لوگ اس کی تکالیف کا احساس کریں۔ اگر کوئی شخص اس کے خط پر عمل کرتا اور اس کو تریزے سمیت اٹھا کر کسی محتاج خانے میں ڈال آتا تو ہوسکتا ہے کہ روسو اس کا ممنون ہونے کے بجائے بس یہی سمجھتا کہ طویل عرصے سے وہ اپنے خلاف ہونے والی جن سازشوں کے خوف میں مبتلا تھا، وہ مکمل ہو گئی ہیں۔

بہرحال زندگی کے آخری دن آ گئے، مگر ہمارے پاس ان دنوں کی تفصیلات موجود نہیں۔ ان پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ یہ البتہ معلوم ہے کہ تریزے بگڑ چکی تھی۔ اس کا رویہ ٹھیک نہ رہا تھا۔ قصبے میں آنے کے چند روز بعد روسو کے وہم شدید ہونے لگے تھے۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کو بندے خانے میں ڈال دیا گیا ہے اور یہ کہ اس کے لئے بچ نکلنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہی۔

2 جولائی 1778ء کو اچانک ہی یہ سب کچھ ختم ہو گا۔

ہمارا فلسفی زندگی کی بازی ہار گیا۔ موت کا سبب کیا تھا؟ یقین سے کچھ نہیں کہا جا

سکتا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ موت دماغ میں خون کی شریان پھٹ جانے کے باعث ہوئی ہے۔ وہ سیر کے بعد لوٹا تو طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ اس نے سر میں درد کی شکایت کی اور پھر اچانک ہی ڈھیر ہو گیا۔

اچانک واقع ہونے والی اموات عموماً افواہوں کا باعث بنتی ہیں۔ کئی لوگوں نے روسو کی اچانک موت سے کئی افسانے گھر لئے۔ انہوں نے مشہور کر دیا کہ روسو نے خودکشی کی ہے۔ اس بات کو سب سے زیادہ مادام سیٹل نے پھیلایا۔ اس نیک بخت نے روسو پر ایک پھرتیلا مضمون لکھا اور اس کی ذہانت و فطانت کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے، مگر موت کا سبب اس نے خودکشی کو ٹھہرایا۔

خیر! خودکشی کی کوئی واضح شہادت یا ثبوت نہیں ہے۔ مگر اس کے حالات نیز جسمانی اور ذہنی کیفیات ایسی تھیں کہ وہ خودکشی پر مائل ہو سکتا تھا۔ اپنے ناول میں اس نے فرد کے اس حق کی پرزور نفی کی تھی کہ وہ اپنے ناقابل برداشت ذہنی دباؤ اور اذیت سے نجات پانے کے لئے خوشی کر سکتا ہے لیکن آخری برسوں میں وہ یہ ماننے پر تیار ہو گیا تھا کہ جب جسمانی یا ذہنی عوارض مسلسل ناقابل برداشت ہوتے چلے جائیں اور ان کا علاج ممکن نہ رہے تو پھر فرد ان سے نجات پانے کے لئے اپنی جان لے سکتا ہے۔ مرنے سے پہلے اس قسم کے حالات سے دو چار فرد انسان نہیں رہتا۔ وہ انسانی حیثیت سے محروم ہو جاتا ہے اور اپنی زندگی کا خاتمہ کرتے ہوئے وہ محض اس جسم سے نجات پاتا ہے جو اس کی روح سے محروم ہو چکا ہوتا ہے۔

یہ باتیں اپنی جگہ ہیں۔ ان سے ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ روسو میں خودکشی کا میلان پیدا ہو رہا تھا لیکن اس قیاس کو یقین میں تبدیل کرنا محال ہے۔ البتہ خودکشی کے خلاف واضح شہادت پانچ ڈاکٹروں کے سرٹیفکیٹ کی صورت میں موجود ہے جس میں انہوں نے دماغ کی شریان پھٹنے کی موت کا سبب قرار دیا ہے۔ یہ بھی ہے کہ مارکوئس دی گرارون جس کے گھر میں روسو کا انتقال ہوا، نے یہ گواہی دی تھی کہ روسو کے جسم پر گولی لگنے یا زہر پینے کی کوئی علامت نہ تھی۔

آرمنوویل میں روسو نے صرف چھ ہفتے گزارے تھے، مگر اس نے وہیں دفن ہونے کی خواہش کی۔ چنانچہ اس کو اس خوبصورت قصبے کی جھیل کے درمیان ایک چھوٹے

سے جزیرے میں گرما کی چاندنی رات میں سپرد خاک کر دیا گیا، جہاں جھیل کے ساکن پانی پر پاپولر کے لمبے سائے پڑتے تھے۔ وہ سولہ برسوں تک وہیں آسودہ خاک رہا پھر توپوں کی گھن گرج اور ڈھولوں کی تھاپ میں اس کی خاک کو اٹھایا گیا اور عظیم افراد کے قومی قبرستان میں پہنچایا گیا۔

یہ توپیں اور بینڈ باجے انقلابیوں کے تھے جنہوں نے روسو کی موت کے چند سال بعد 1789ء میں فرانس پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ ایک عظیم الشان انقلاب تھا جس نے امراء سے اقتدار چھینکر بورژوا طبقے کے حوالے کر دیا۔ اس انقلاب کے لئے زمین ہموار کرنے والے بہت سے تھے لیکن عام لوگوں کے ذہن میں زیادہ تر بس دو ہی نام رہ گئے............ ایک والٹیئر تھا اور دوسرا روسو۔ بلاشبہ یہ دونوں اٹھارہویں صدی کے فرانس کے مشہور ترین ذہنی ہیرو تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ انقلاب کی آگ ان کی تحریروں نے بھڑکائی ہے۔ یہاں تک کہ پندرہویں لوئی بادشاہ نے بھی............ جس کے عہد میں انقلاب برپا ہوا اور جس کو آخر کار انقلابیوں کے ہاتھوں جان سے ہاتھ دھونے پڑے............ یہ کہا تھا کہ ''بغاوت'' کی ذمہ داری والٹیئر اور روسو پر عائد ہوتی ہے۔

انقلابی ان دونوں کے گن گاتے تھے۔ والٹیئر روسو کے انتقال سے صرف چار ہفتے پہلے 30 مئی 1778ء کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا تھا۔ 1789ء کے انقلاب کے بعد ان دونوں کو دیوتاؤں جیسا درجہ دیا گیا۔ انقلابی کونسل نے عقیدت کے اظہار کے طور پر ان دونوں کے جسد خاکی قومی قبرستان میں منتقل کرنے کا حکم دیا تھا۔

1790ء میں فرانس کے قومی اسمبلی نے روسو کی بیوہ تریزے کے لئے بارہ سو فرانک کا سالانہ وظیفہ جاری کیا۔ تین سال بعد کے کنونشن میں وظیفہ کی رقم بڑھا کر پندرہ سو فرانک سالانہ کر دی گئی اور ساتھ ہی روسو کی یادگار قائم کرنے کے لئے اس کا مجسمہ تیار کرنے کا حکم جاری ہوا۔ پیرس والوں کے اس سلوک کا اثر دوسرے شہروں نے بھی قبول کیا۔ چنانچہ کئی شہروں اور قصبوں میں روسو کے مجسمے نصب کئے گئے۔ یہ وہ مقامات تھے جہاں کبھی روسو نے قیام کیا تھا۔ اس کے مسجمے جنیوا، مونٹ پلیر، لیونز اور گرینول میں بھی نصب کیے گئے اور اس کی یاد میں تقریبات منعقد کی گئیں۔ یوں مرنے کے بعد بھی اس کو وہ عزت اور شہرت نصیب ہوئی جس کی اس نے زندگی میں شدت سے تمنا کی تھی۔

روسو دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ایک لحاظ سے اس کی داستان ختم ہوگئی۔ مگر ہم نے اس کی دو یادگاروں کا ذکر کرنا ہے ان میں سے ایک تریزے ہے اور دوسری اس کی خودنوشت جو اس کی موت کے بعد ''اعترافات'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔

تریزے کا معاملہ یہ ہے کہ شوہر نامدار کی وفات کے بعد پنشن اور ناشرین کی طرف سے رائلٹی کی صورت میں اس کو مجموعی طور پر لگ بھگ چالیس ہزار فرانک ملے جو اس زمانے میں خاصی رقم تھی۔ تریزے سلیقہ شعاری سے کام لیتی تو اس کی بقیہ زندگی اچھی گزر سکتی تھی۔ مگر اس بت دہقان کو سلیقے کیا غرض۔ ادھر روسو کی آنکھیں بند ہوئیں اور ادھر اس نے ارمنوویل کے ایک ادنیٰ ملازم سے آنکھیں چار کیں۔ وہ بھی کائیاں فریبی ثابت ہوا۔ بیوہ کی جیب میں جب تک مال رہا، وہ اس کا دم بھرتا رہا اور اس کی رقم اڑاتا رہا۔ جیب خالی ہوئی تو راہ بدل لی۔ تریزے کے برے دن شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ بڑھاپے میں وہ تھیٹر کے دروازے پر تماش بینوں سے خیرات مانگ کر گزارہ کرنے پر مجبور ہوگئی۔ یہ ایک سیدھی سادی زندگی کا دردناک انجام تھا۔ آخر کار روسو کی وفات کے تیرہ سال بعد 1801ء میں 80 سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوا۔

جہاں تک ''اعترافات'' کا تعلق ہے اس کتاب کو خودنوشت سوانح عمریوں کے عالمی ادب میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ روسو کے کئی سوانح نگاروں اور نقادوں نے اس کو روسو کی بہترین تصنیف کا درجہ دیا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ فرانسیسی ادب میں ایسی کتابیں کم ہی ملتی ہیں جن کا اسلوب اس قدر رواں، تیز و طرار اور تیکھا ہو۔ اس میں کرداروں کی تصویر کشی بہت متاثر کن ہے اور اس میں زندگی کے مضحکہ خیز اور المناک دونوں پہلو نمایاں ہو کر سامنے آئے ہیں۔

روسو نے یہ کتاب 1766ء کے موسم خزاں اور سرما کے درمیانی عرصے میں انگلستان کے قصبہ ووٹون میں لکھی شروع کی تھی۔ البتہ اس کو اپنی یادداشتیں رقم کرنے کا خیال ایک عرصے سے تھا۔ اس زمانے میں یادداشتیں مرتب کرنے کا رواج بھی عام تھا۔ مگر روسو کے اعترافات اس دور میں لکھی جانے والی خودنوشت سوانح عمریوں سے بہت مختلف ہیں۔ لکھنے والے اپنی خامیاں چھپاتے اور خوبیوں کی نمائش کرتے تھے۔ خود کو مہذب اور شائستہ، نیک دل اور خوش اطوار ثابت کرتے تھے۔ لیکن روسو نے یہ سب کچھ نہیں کیا۔ اس نے

سادگی اور قابل تعریف حد تک سچائی کا سہارا لیا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھا چاہتا۔ سب کچھ بتانے پر آمادہ ہے۔ بناوٹ اور تصنع سے دور ہے۔ وہ اپنے قارئین کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتا ہے اور نہ ہی تعریف کا آرزومند ہے۔ بعض مقامات پر وہ زیادہ جذباتی ہو جاتا ہے اور سچ پر زیادہ زور دینے لگتا ہے۔ ہم مان لیتے ہیں کہ وہ صرف سچ ہی بتانا چاہتا تھا، لیکن ضروری نہیں کہ حافظ ہمیشہ اس کا ساتھ دے۔ لہٰذا بعض ایسی باتیں بھی اس کتاب میں شامل ہو گئی ہیں جن کو غلط ثابت کرنا آسان ہے۔ بعض دوسرے مقامات پر سن اور تاریخوں کے معاملے میں اس سے کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں۔ تاہم ہم یقین کر سکتے ہیں کہ یہ حقائق کو چھپانے سے پیدا ہونے والی غلطیاں نہیں بلکہ حافظے کی کوتاہیوں کا نتیجہ ہے۔

جان بوجھ کر اس نے شاید ہی کوئی بات چھپائی ہو۔ اصل میں بات یہ ہے کہ اس کو اپنے اوپر ہنسنا آتا ہے اور وہ اپنی حماقتوں کا ذکر بھی صاف طور پر کر دیتا ہے۔ ہم نے لوزین کے اس پروفیسر کا ذکر کیا ہے جس کے گھر میں روسو نے کنسرٹ دیا تھا اور اپنی نااہلی کے باعث دوسروں کی ہنسی کا سامان بنا تھا۔ اعترافات میں اس واقعہ کا ذکر ہے اور روسو نے اپنی مضحکہ خیز حالت کو خوب بیان کیا ہے۔

خیر روسو نے اپنی کہانی سناتے ہوئے اپنی مصیبتوں، محرومیوں اور بدنصیبوں کا ذکر بھی کیا ہے مگر وہ ان کا ماتم نہیں کرتا۔ بس ان کو بیان کر دیتا ہے اور وہ یہ کام اس قدر سادگی اور خلوص سے کرتا ہے کہ ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ ہم کو اس کے دکھوں پر افسوس ہوتا اور ساتھ ہی ساتھ اس کی جرأت اظہار پر رشک بھی آتا ہے۔

اس کا اسلوب نگارش، لفظوں کا انتخاب اور بندش شاندار ہے۔ جو کوئی یہ کتاب اٹھاتا ہے وہ اس کو مکمل کیے بغیر چھوڑنا نہیں چاہتا۔ روسو بازاری قسم کے چھوٹے چھوٹے واقعات بھی اس انداز سے ہمارے سامنے لاتا ہے کہ ہم اس کی تحریر کے سحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

خوب! لیکن نقادوں نے چند ایسے واقعات کی نشاندہی کی ہے جن کو روسو نے درست طور پر بیان نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ تعارفی کتاب ''اعترافات'' کے مفصل تنقیدی جائزے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ پھر بھی ایک آدھ مثال یہاں پیش کی جا سکتی ہے۔ روسو کے

سوانح نگار ہنری لارڈ بروگھم کا کہنا ہے کہ نیوشیٹل کے مقام پر روسو نے اپنے گھر پر جس حملے کا ذکر کیا ہے اس کے بارے میں عمومی تاثر یہ ہے کہ وہ محض افسانہ ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اچھا! روسو کے دفاع میں ہم کو یہ ضرور کہنا چاہئے کہ اگر یہ واقعہ محض افسانہ ہو تو بھی اس کی ساری ذمہ داری روسو پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ چنانچہ اس کے اکثر سوانح نگاروں کا موقف یہ ہے کہ تریزے نے جان بوجھ کر روسو کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ ان کے گھر پر حملہ کیا گیا ہے۔ اصل میں وہ یہ احساس دلانا چاہتی تھی کہ اس مقام پر ان کا مزید قیام خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ اس مقام سے بیزار تھی اور وہاں سے نکلنے کی آرزومند تھی۔

ہم کو نہیں بھولنا چاہئے کہ روسو کے لئے حالات شاید ہی کبھی زندگی میں سازگار رہے تھے۔ اس کا بچپن اور خاندانی ماحول بھی شخصیت کی صحت مند نشوونما میں معاون نہ ہو سکتا تھا۔ ورثے میں جو شخصی خصوصیات اس کو ملیں، وہ شاندار نہ تھیں۔ وہ باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے سے بھی محروم رہا تھا مگر ان خامیوں کے باوجود روسو نے دنیا کے واجب الاحترام مفکرین کی فہرست میں اپنا درج کروایا ہے۔ یہ ایک عظیم الشان کامیابی ہے۔

ژاں ژاک روسو پر مزید مطالعہ کے لیے مندرجہ ذیل کتب کی سفارش کی جاتی ہے:

1- Broome, J.H., Ropusseau: A Study of his Thought: Edward Arnold (Publishers) Ltd, London, 1963.

2- Cassirer Ernst, The Question of Jean Jacques Rousseau, translated by Peter Gay: Columbia University Press, 1954.

3- Chapman, John W, Rousseau: Totalitarian or Liberal: Columbia University Press, 1956.

4- Hidel Charles W Jean-Jacques Rousseau, Morlist, Indianapolis, Ind: Bobbs-Merrill, 1962.

5- Maritain, Jacques, Three Reformers, Greenwood Press Publishers, Westport, 1950.

6- Masters, Roger D, Rousseau, Princeton University Press, 1968.

***